ملاقات

منتخب علمی، فکری، تذکیری مضامین کا مجموعہ

ابو یحییٰ

انذار پبلیشرز

A Non-Profit Organization

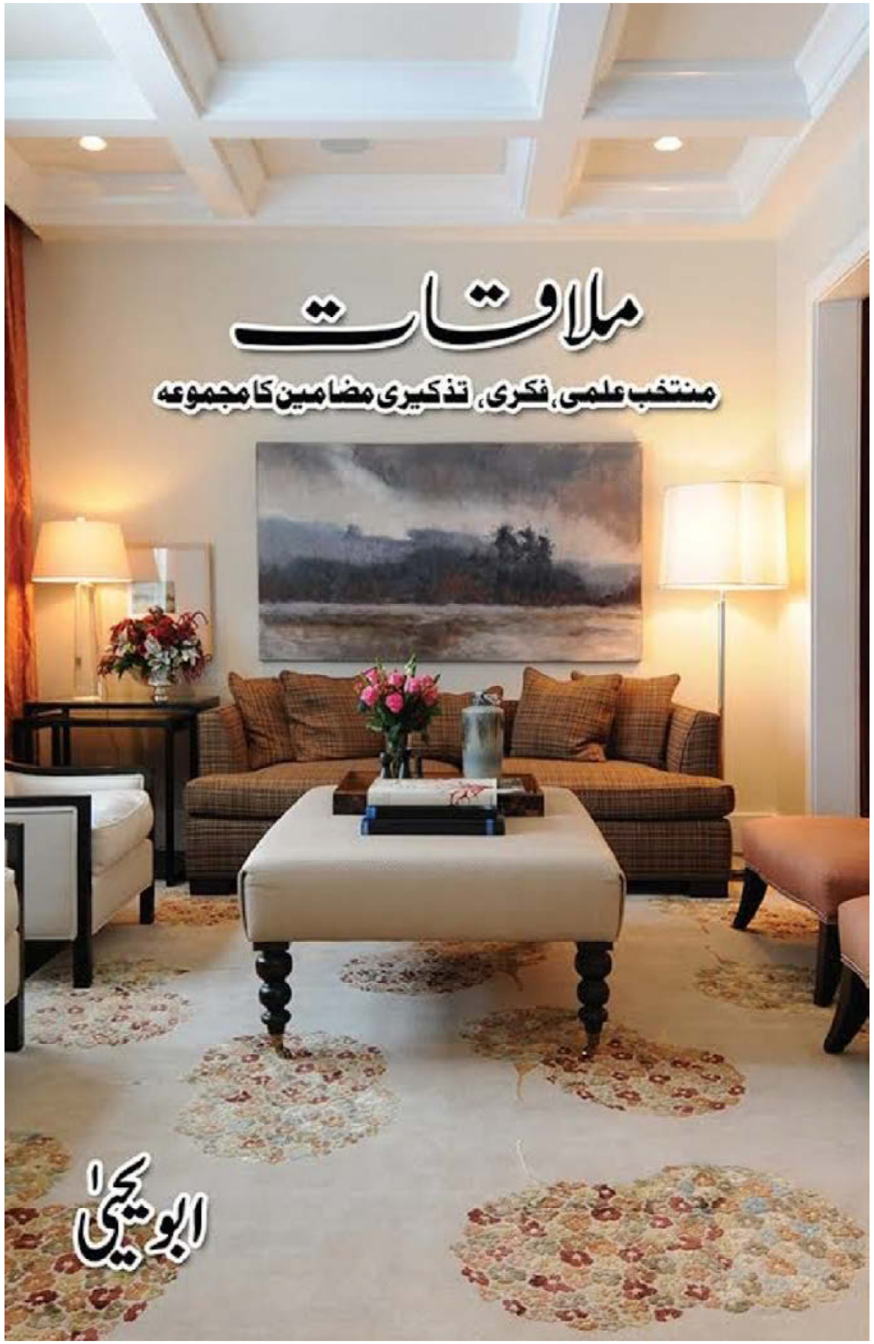

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

نام کتاب	:	ملاقات
مصنف	:	ابو یحییٰ
ناشر	:	انذار پبلیشرز: 03323051201
تعداد	:	3300
ویب سائٹ	:	www.inzaar.com
ای میل	:	abuyahya267@gmail.com
ٹائٹل	:	حافظ حسن سلیم
قیمت	:	300روپے
ملنے کا پتہ	:	پوری دنیا میں کسی بھی جگہ گھر بیٹھے یہ کتاب حاصل کرنے کے لیے رابطہ کیجیے۔

(0092)-03323051201

یا آن لائن ہماری ویب سائٹ پر آرڈر کیجیے

ویب سائٹ www.Inzaar.org

حضرت یوسف علیہ السلام کے نام

جن کی زندگی کو قرآن مجید بہترین داستان قرار دیتا ہے اور
جس داستان کا سبق ہے کہ اللہ تعالیٰ صبر اور تقویٰ اختیار
کرنے والے کسی شخص کو کبھی بے آسرا بے سہارا نہیں چھوڑتا

فہرست

ملاقات 07

کریم ابن کریم 09

علامہ اقبال کی خودکشی 19

مسائل یا چیلنج 27

طلاق اور خاندانی جھگڑوں کا حل؟ 34

معجزوں کا دور 43

کامیاب زندگی کے کچھ نسخے 49

فکر و پریشانی اور غم سے نجات 58

مسائل سے نمٹنے کا عملی طریقہ 65

ہمارے بچے ہمارا سرمایہ ہیں 72

اسلام، مسیحیت اور مسلمان 79

مشاہداتِ سفر 85

شیعہ سنی جھگڑے کا حل 95

مقتل کے باسیوں کا اب حال کیا سنائیں 105

ارتقا اور خارجی رہنمائی 118
اسلام اور لونڈیاں 125
کیا اللہ اور خدا الگ الگ ہیں؟ 139
نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبور میں پیش گوئی 147
ہم جنس پرستی 161
تاریخ اور ختم نبوت 173
فتنہ دجال اور سورۂ کہف 189
آنے والی قیامت: انجام کا آغاز (Begining of the End) 200
یاجوج ماجوج کی حقیقت 214
قیامت کی سزا جزا کے ضابطے 223
خالق و مخلوق کے عارف 230

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ملاقات

مجھے عام طور پر لوگ تذکیری تحریروں کے حوالے سے جانتے ہیں۔ ''جب زندگی شروع ہوگی'' جیسی کتابیں میری پہچان ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میری زندگی کا اصل مشن ایمان و اخلاق کی دعوت کو عام کرنا ہے۔ اس لیے زیادہ تر میں اِسی پہلو سے لکھتا ہوں۔

تاہم میں ایک داعی ہونے کے ساتھ ایک طالب علم بھی ہوں اور صدیوں پر محیط مسلمانوں کی علمی اور فکری روایت سے واقف ہوں۔ اس کے ساتھ عصر حاضر میں مسلمانوں کو انفرادی، قومی اور ملی سطح پر جو علمی و فکری مسائل درپیش ہیں، میں ان سے بھی بخوبی آگاہ ہوں اور سالہا سال سے اپنی بساط بھر لوگوں کی رہنمائی کی کوشش کرتا رہا ہوں۔ اس مقصد کے لیے میں اپنے ماہنامے میں ''ملاقات'' کے عنوان سے ایک کالم لکھتا تھا۔ اس کالم میں زیادہ تر میرے وہ مضامین شائع ہوتے تھے جن کا تعلق انفرادی اور اجتماعی مسائل اور علمی و فکری مباحث سے ہے۔

تاہم ان مضامین میں بھی میری ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ ان مباحث کو حتی الامکان آسان زبان میں قارئین کے سامنے پیش کیا جائے۔ چنانچہ یہ مضامین بہت اہم موضوعات کا احاطہ کرنے کے باوجود بہت عام فہم انداز میں لکھے گئے ہیں۔ احباب کا مسلسل تقاضہ تھا کہ ان مضامین کو قارئین کے سامنے کتابی شکل میں پیش کیا جائے۔ چنانچہ ان مضامین کو جمع کیا گیا۔ اندازہ یہ ہوا کہ ان

مضامین کو ایک ساتھ شائع کیا گیا تو کتاب بہت ضخیم ہو جائے گی۔ چنانچہ ان کو دو حصوں میں تقسیم کر کے شائع کیا جا رہا ہے۔ پہلا حصہ ''ملاقات'' ہی کے نام سے قارئین کی خدمت میں پیش ہے جبکہ باقی مضامین بھی انشاءاللہ جلد کتابی شکل میں پیش کر دیے جائیں گے۔

کتاب کی فہرست سے قارئین یہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ مضامین بہت متنوع نوعیت کے ہیں۔ ان میں شخصیت کی تعمیر سے لیکن خاندانی مسائل تک، قومی رویوں کی اصلاح سے لے کر ملی معاملات تک، علمی و فکری مباحث سے لے کر دعوت اور قرب قیامت کے احوال تک بہت کچھ زیر بحث آیا ہے۔ مجھے اللہ کی رحمت سے امید ہے کہ باذوق قارئین ان کے مطالعے کے بعد اپنے علم، عمل اور فکر کے مختلف پہلوؤں پر نئے زاویے سے غور کرنے کے قابل ہو سکیں گے۔

مضامین کی ترتیب میں کوئی خاص ربط نہیں سوائے ان مضامین کے جن میں معنوی ربط پایا جاتا ہے۔ کتاب کا آغاز ایک جلیل القدر پیغمبر حضرت یوسف کی علیہ السلام کی سیرت کے ان پہلوؤں سے ہوتا ہے جن میں آج بھی ہمارے لیے بڑی رہنمائی ہے۔ جبکہ کتاب کا اختتام ختم نبوت کے پس منظر میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بے مثال سیرت کے ان پہلوؤں سے ہوتا ہے جن سے آپ واقف تو ہوں گے، مگر اس پہلو سے آپ نے ان پر شاید غور نہیں کیا ہوگا جس سے اِس خادم نے سرکار دو عالم کی زندگی کو نمایاں کرنے کی حقیر کوشش کی ہے۔

یہی انبیا علیہم السلام وہ ہستیاں ہیں جو ہمارے لیے اس دنیا میں مینارہ نور ہیں۔ پروردگار کی شان عطا سے دعا ہے کہ اس فقیر کی یہ ''ملاقات' ہر پڑھنے والے کے لیے روز قیامت، ان روشن چہروں کے ساتھ ابدی رفاقت میں بدلنے کا سبب بن جائے۔ آمین۔

ابو یحییٰ

کریم ابن کریم

مسلمانوں کو اہل کتاب پر ایمانی اعتبار سے ایک برتری اس طرح حاصل ہے کہ مسلمان نہ صرف آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے گہری عقیدت و محبت رکھتے ہیں بلکہ دیگر تمام پیغمبروں کو بھی یکساں طور پر اللہ کا نبی مانتے اور ان سے محبت اور عقیدت کا تعلق رکھتے ہیں۔ اس کا سبب اللہ تعالیٰ کا وہ فیصلہ ہے جو قرآن کریم میں بار بار دہرایا گیا ہے جس کے مطابق ایک مسلمان کے لیے تمام انبیا پر ایمان رکھنا ضروری ہے۔ کسی ایک نبی کا انکار تمام انبیا کے انکار کے مترادف ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ان حضرات انبیا سے متعلق یہ خصوصی اہتمام فرمایا کہ یہ لوگ ہر گناہ سے معصوم رکھے گئے۔ اس لیے یہ حضرات اپنی سیرت و کردار اور اخلاق و اعمال میں ہمیشہ بے داغ رہے۔ پچھلی امتوں سے نہ صرف یہ جرم سرزد ہوا کہ انھوں نے بعض انبیا کی نبوت کا انکار کر دیا بلکہ انھوں نے بہت سے انبیا کی طرف عقیدے اور عمل کی آلائشوں کو منسوب کر دیا۔ قرآن مجید نے جب ان انبیا کے واقعات کو بیان کیا تو اس میں یہ اہتمام بھی کیا کہ اہل کتاب کے بہتانوں کی تردید کرتے ہوئے صحیح بات بیان کر دی جائے۔ اس طرح قرآن مجید کتابِ ہدایت ہونے کے ساتھ ساتھ حضرات انبیا کی سیرت و کردار کا ایک بے داغ ریکارڈ بھی بن گیا ہے۔ اس ریکارڈ کا مطالعہ ایک مسلمان کو ان بے مثل انسانوں کی شخصیت کے ایسے پہلوؤں سے روشناس کراتا ہے جس میں وہ اپنے لیے رہنمائی کے بہت سے پہلو تلاش کر سکتا ہے۔

سیدنا یوسف علیہ السلام ایک رول ماڈل

ان انبیا میں حضرت یوسف کا نام اس لیے بہت اہم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی زندگی کے واقعات کو قرآن کریم میں ''احسن القصص''، یعنی بہترین قصے کے عنوان سے بیان کیا ہے۔ سورۂ یوسف میں بیان ہونے والے ان کے واقعات میں ان کی شخصیت اور سیرت کا جو نمونہ سامنے آتا ہے وہ بے مثل ہے۔ خاص کر موجودہ زمانے میں مسلمان جس اخلاقی بحران کا شکار ہیں، اس میں سیدنا یوسف کی زندگی ان کے لیے ایک بہترین نمونہ ہے۔ آج میرا ارادہ یہ ہے کہ اللہ کے اس محبوب پیغمبر کی سیرت و شخصیت کے حوالے سے آپ کے ساتھ کچھ گفتگو کروں اور ہم مل کر یہ دیکھنے کی کوشش کریں کہ اس عظیم پیغمبر کی ذات، جسے نبی آخر الزماں سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ''کریم ابن کریم ابن کریم ابن کریم یعنی یوسف بن یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم، (بخاری، رقم: 3382)'' کے نام سے یاد کیا، آج کے حالات میں کس طرح ہمارے لیے ایک بہترین نمونہ ہے۔

شکایت اور منفی سوچ سے بلند صبر کی نفسیات

جیسا کہ اوپر حدیث کے حوالے سے واضح ہے کہ حضرت یوسف حضرت ابراہیم کے پڑپوتے، حضرت اسحاق کے پوتے اور حضرت یعقوب کے بیٹے تھے۔ یہ تینوں حضرات جلیل القدر پیغمبر تھے۔ بچپن ہی سے آپ کی سیادت و فضائل کے آثار ظاہر تھے۔ خاص طور پر قرآن کریم آپ کے ایک خواب کا تذکرہ کرتا ہے جس میں آپ نے گیارہ ستاروں اور چاند سورج کو اپنے سامنے سجدہ ریز دیکھا۔ آپ کے ان آثار کی بنا پر آپ کے والد گرامی آپ کو بہت چاہتے تھے۔ آپ کے بھائی اس محبت اور توجہ کی وجہ سے آپ سے حسد کرنے لگے اور آخر کار انھوں نے آپ کو ایک اندھے کنویں میں پھینک ڈالا جہاں سے ایک قافلے والے آپ کو غلام بنا کر فلسطین سے مصر لے گئے اور وہاں ایک مقامی عہدیدار (عزیز مصر) کے ہاتھوں بیچ ڈالا۔ یوں چھوٹی عمر

ہی میں آپ کو انسانوں کی طرف سے بدترین تجربات پیش آئے۔ لیکن ان تجربات کی بنا پر آپ منفی سوچ میں مبتلا نہیں ہوئے۔ قرآن مجید میں بیان ہوا ہے کہ آپ کے والد پر آپ کی جدائی کا صدمہ بے حد شاق گزرا۔ مگر آپ نے یہ معلوم ہونے کے باوجود کہ یوسف کی گمشدگی میں آپ کے بیٹوں کا ہاتھ ہے، صبر سے کام لیا اور اس عظیم صدمے پر اللہ ہی سے مدد کی درخواست کرتے رہے۔ عظیم باپ کے عظیم بیٹے نے بھی یہی روش اختیار کی۔ برے حالات کے ردعمل میں آپ نے برائی، غصے، انتقام اور شکایت کو اپنی شخصیت کا حصہ نہیں بننے دیا بلکہ آپ نے نیکی، صبر اور برداشت کے وہ اوصاف اختیار کیے جن کا اظہار آئندہ زندگی میں کئی مواقع پر ہوا۔

یہ آپ کی سیرت کا پہلا سبق ہے کہ زندگی میں انسان کو اگر دوسروں کی طرف سے برے تجربات پیش آئیں تب بھی اسے ردعمل کا شکار ہونے کے بجائے اللہ تعالیٰ پر توکل، بھروسے اور دعا کا سہارا تھام لینا چاہیے۔ اس طرح انسان اللہ تعالیٰ کی خصوصی نصرت و رحمت کا حقدار بن جاتا ہے۔ جس کا اظہار حضرت یوسف کی زندگی میں بھرپور طریقے سے ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنے خصوصی فضل سے نوازا اور نبوت کے ساتھ ساتھ عزت، اور اپنے زمانے میں دنیا کی سب سے بڑی سپر پاور یعنی مصر کی سلطنت کا اقتدار بھی آپ کو عطا کر دیا گیا۔ تاہم انسان اگر حالات کے ردعمل میں خود برائی اختیار کر لے تو سوائے اس کے کچھ نہیں ہوتا کہ بہت سارے برے لوگوں میں ایک اور برے شخص کا اضافہ ہو جاتا ہے۔

بدقسمتی سے آج کے مسلمان انفرادی اور اجتماعی دونوں سطح پر ردعمل کی نفسیات کا شکار ہیں۔ ان میں صبر و تحمل اور برداشت کا مادہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ راستے میں گاڑی چلاتے ہوئے کوئی شخص غلطی کر دے یا غیر مسلم اقوام کی طرف سے کوئی زیادتی سامنے آ جائے، مسلمان اپنی حیثیت اور منصب کو بھول کر فوراً دوسروں کی سطح پر اتر آتے ہیں۔ یہی ردعمل کی وہ نفسیات ہے

جس کی بنا پر ہمارے ہاں بڑھتے بڑھتے دہشت گردی اور خودکش حملوں کا چلن عام ہو گیا ہے۔

عفت اور پاکدامنی

حضرت یوسف کی زندگی کا ایک اہم واقعہ وہ ہے جب عزیز مصر کے ہاں آپ بطور ایک غلام کے لے جائے جاتے ہیں، مگر وہ آپ کو غلام سمجھنے کے بجائے بڑی عزت و احترام کے ساتھ رکھتا ہے۔ آپ جوان ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو دیگر خصوصیات کے ساتھ مردانہ جمال اور وجاہت سے بھی نوازا۔ آپ کی یہی خوبصورتی، والدین سے جدائی اور وطن سے دوری کے بعد آپ کی زندگی میں ایک دوسرا طوفان لانے کا سبب بن گئی۔ عزیز مصر کی بیوی زلیخا آپ پر فریفتہ ہو گئی۔ آج کے مغربی معاشروں کی طرح اس دور میں بھی زنا و بدکاری ایک عام معاملہ تھا۔ چنانچہ ایک روز اس نے موقع غنیمت جانا اور کمرے کا دروازہ بند کر کے آپ کو دعوت گناہ دی۔ کوئی اور نوجوان ہوتا تو یہ اس کے لیے ایک بہترین موقع تھا۔ لیکن صبر کے جس بیج کو آپ نے اپنی شخصیت میں بویا تھا وہ اب ایک تناور درخت بن چکا تھا۔ اس درخت کی چھاؤں تلے آپ اس آگ کی تپش سے محفوظ رہے جو زلیخا کے دل میں سلگ رہی تھی۔ آپ نے اس کی دعوتِ گناہ کا جواب جوانی کے جوش کے بجائے خدا خوفی سے دیا اور اس گندگی میں پھسلنے سے انکار کر دیا۔

عین اس موقع پر عزیز مصر آ گیا۔ زلیخا نے اپنے گناہ کا الزام آپ پر تھوپنا چاہا، مگر اللہ تعالیٰ نے اس الزام سے آپ کو بچا لیا اور عزیز پر واضح ہو گیا کہ خرابی اسی کی بیوی میں ہے۔ یوسف کے جمال اور زلیخا کے عشق کے قصے عام ہوئے تو شہر کی دیگر خواتین نے بھی قسمت آزمائی کرنے کی کوشش کی، مگر ناکامی ان کا مقدر بنی۔ مگر زلیخا نے اپنا عزم ظاہر کر دیا کہ یہ پیکر عفت اگر اس کے دام دلفریب میں نہ آیا تو جیل کی کوٹھری اور ذلت اس کا مقدر ہو گی۔ یہ دیکھ کر صبر و رضا کی اس آہنی چٹان نے پروردگار سے دعا کی کہ وہ جیل کی ذلت کو گناہ کی لذت پر ترجیح دیتے ہیں۔ اپنی

عفت کے بارے میں آپ کی حساسیت کا عالم یہ تھا کہ جیل میں کئی برس رہنے کے بعد بھی جب آپ کو رہائی کا پروانہ ملا تو آپ نے اپنی رہائی کے لیے یہ شرط رکھی کہ ان خواتین سے اس واقعے کی حقیقت معلوم کی جائے تاکہ آپ کی اخلاقی حیثیت پر کوئی الزام باقی نہ رہے اور عزیز بھی جان لے کہ آپ نے کسی قسم کی کوئی خیانت نہیں کی۔ جب زلیخا اور دیگر عورتوں نے آپ کی بے گناہی اور اپنے گناہ کا اعتراف کر لیا تبھی آپ جیل سے باہر آئے۔

یہ آپ کی سیرت کا دوسرا سبق ہے۔ خاص کر آج کے ان نوجوانوں کے لیے اس بات کو سمجھنا بہت ضروری ہے کہ پاکدامنی ایک بندۂ مومن کا سب سے بڑا اثاثہ ہے۔ خود گناہ کی طرف جانا تو دور کی بات ہے، اگر گناہ ایک سیلاب کی طرح ہر طرف سے اپنے گھیرے میں لے لے تب بھی ایک بندۂ مومن کو پاکدامنی اختیار کرنی چاہیے۔ پاکدامن یوسف کی طرح ہر ایسی جگہ سے بچ کر بھاگ جانا چاہیے، چاہے عافیت کی راہ جیل کے کسی جہنم تک ہی جاتی ہو۔ اس لیے کہ زنا کا انجام خدا کی جہنم اور اس کی بھڑکائی ہوئی آگ ہے جس کی برداشت کسی انسان میں نہیں۔ آج کے دور میں ہر طرف بدکاری کا سیلاب آیا ہوا ہے اور اس سیلاب سے بچ جانے والے بلاشبہ کل قیامت میں سیدنا یوسف کے ہمرکاب ہوں گے۔

انکساری اور اعتماد

آپ کی زندگی کا اگلا درس انکساری ہے۔ بادشاہ کے دربار میں جب زلیخا اور خواتین نے اعتراف جرم کر لیا اور آپ کا بے گناہ ہونا ثابت ہو گیا تب آپ نے جو کلمات ارشاد فرمائے وہ کسی عام انسان کی زبان سے نہیں نکل سکتے تھے۔ آپ نے اس موقع پر یہ وضاحت کی کہ میں نے اپنی صفائی پیش کرنے کا یہ عمل اس لیے نہیں کیا کہ میں اپنے نفس کی براءت ظاہر کر رہا ہوں، نفس تو بدی پر اکساتا ہی ہے، سوائے اس کے کسی پر میرے رب کی رحمت ہو۔

یہ الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ انھیں کہنے والا خدا کی عظمت کے احساس میں اس طرح جی رہا ہے کہ اسے اپنی خوبی نظر نہیں آتی۔ وہ اپنی ہر خوبی کو اپنے رب کی عطا اور اس کی رحمت ہی سمجھتا ہے۔ تاہم اس عاجزی کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ احساس کمتری کا شکار تھے۔ بلکہ اپنی صلاحیتوں پر انھیں بھرپور اعتماد تھا۔ جب بادشاہ نے آپ کو اپنا مصاحب خاص بنانا چاہا تو آپ نے آنے والے اس قحط سے، جس کی پیش گوئی آپ ہی نے کی تھی، نمٹنے کے لیے انتظام مملکت سنبھالنے کی ذمہ داری کے لیے پورے اعتماد سے خود کو پیش کر دیا۔

انکسار اور اعتماد کا یہ حسین توازن کسی بھی انسان کی اعلیٰ ترین خوبی ہوتا ہے۔ انکساری اسے کبھی تکبر کے قریب بھٹکنے نہیں دیتی اور اعتماد اسے ہر قسم کے احساس کمتری سے محفوظ رکھتا ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ قارئین اس بات کو سمجھ لیں کہ انسانوں کو دوسرے انسانوں سے جب بھی نقصان پہنچتا ہے تو اس کی ایک بڑی وجہ لوگوں کے اندر پایا جانے والا تکبر اور احساس کمتری ہوتا ہے۔ متکبرین دوسروں کی جان مال آبرو کو نقصان پہنچاتے ہیں اور احساس کمتری میں مبتلا لوگ ریاکاری، نمود و نمائش اور اسراف وغیرہ جیسی اخلاقی برائیوں کو معاشرے میں عام کرتے ہیں جو ہزار برائیوں کی جڑ ہیں۔ جب کہ انکساری اور اعتماد کے حامل لوگ انسانوں کو ہمیشہ فائدہ پہنچاتے ہیں۔

عدل و حکمت اور تدبیر

حضرت یوسف نے جس اعتماد سے یہ ذمہ داری اٹھائی اسے نبھانے کے لیے ان کے پاس عدل و حکمت، تدبیر اور پلاننگ کے اوصاف بدرجہ اتم موجود تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ قحط سات برس بعد شروع ہوگا اور سات برس تک جاری رہے گا۔ ایگریکلچرل ایج میں اتنے طویل عرصے تک قحط کا مطلب یہ تھا کہ لوگوں کی اکثریت فاقے سے مر جائے اور پوری تہذیب اور سلطنت تباہ ہو جائے۔ مگر حضرت یوسف نے اس سے نمٹنے کے لیے بہترین انتظامات کیے۔ قحط سے پہلے

کے سات برس تک جب معمول کی پیداوار ہو رہی تھی انھوں نے لوگوں کو صرف ان کی ضرورت کا غلہ دیا اور باقی غلے کو محفوظ کر دیا۔ یوں خوراک کا ایک بہت بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا۔

قحط کے دنوں میں انھوں نے راشنگ سسٹم متعارف کرایا۔ جس میں اصول تھا کہ ہر شخص کو راشن لینے خود آنا پڑتا تھا تاکہ غلے کی ذخیرہ اندوزی نہ ہو سکے۔ غلہ دیتے وقت ناپ تول کی درستی کا خصوصی انتظام تھا۔ لوگوں کو زیادہ سے زیادہ ایک اونٹ پر لادے جانے کے قابل ہی غلہ دیا جاتا تھا۔ یہ سارے معاملات آپ کی نگرانی میں ہوتے۔ اس حکمت و تدبیر کا نتیجہ یہ نکلا کہ مصر اور اس کے اردگرد کے کئی ممالک کے لاکھوں لوگوں کی جانیں آپ نے اپنی حکمت سے بچا لیں۔

عدل و حکمت اور تدبیر کا یہی وصف ہر بندۂ مومن سے مطلوب ہوتا ہے۔ زندگی میں اچھے برے حالات ہر انسان پر آتے ہیں۔ بندۂ مومن کبھی ایسا نہیں کرتا کہ فراخی کے دنوں میں خوب خرچ کرے اور مجبوراً تنگی کے دنوں میں لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتا رہے۔ مومن اپنی زندگی کو پلان کرتا ہے۔ اچھے برے حالات کی تیاری کرتا ہے۔ پلاننگ کا یہی وصف اسے زندگی کے ہر سرد و گرم میں سرخرو رکھتا ہے۔ وہ نہ صرف خود ذلت و محتاجی سے محفوظ رہتا ہے بلکہ مشکل وقت میں دوسروں کی مدد کرتا اور اللہ کی راہ میں خرچ کرتا ہے۔ یوں دنیا اور آخرت کی بھلائیاں دونوں ہاتھوں سے سمیٹتا ہے۔

اعلیٰ ظرفی اور برائی کے جواب میں بھلائی

برائی کے جواب میں برائی نہ کرنا ایک بات ہے، مگر برائی کے جواب میں بھلائی کرنا وہ وصف ہے جو اللہ تعالیٰ انتہائی خوش نصیب لوگوں کو عطا کرتے ہیں۔ اعلیٰ ظرفی کا یہ وصف سیدنا یوسف کی زندگی میں نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ سیدنا یوسف کے واقعے میں اس کے کئی مظاہر نظر آتے ہیں۔ اس کا سب سے بڑا مظہر تو اپنے ان ظالم بھائیوں کے ساتھ آپ کا معاملہ تھا جنھوں

نے آپ کو اپنے ماں باپ اور وطن سے جدا کر کے غلام بنا دیا تھا۔ جب مصر میں سات سالہ قحط پڑا تو اس کے اثرات دور دور تک پھیلے۔ یہاں تک کہ ان کا آبائی علاقہ فلسطین جو ایک دوسرا ملک تھا وہ بھی اس کے اثرات سے متاثر ہوگیا۔ ان کے بھائی غلہ کی امید میں مصر آئے۔ وہ حضرت یوسف کو نہیں پہچان سکے تھے، مگر انہوں نے اپنے بھائیوں کو پہچان لیا تھا۔ آپ اگر چاہتے تو اسی لمحے ان دس بھائیوں کو سولی پر لٹکا دیتے یا کم از کم غلہ دینے سے انکار کر دیتے۔ مگر اس کے برعکس، نہ صرف آپ نے انھیں غلہ دیا بلکہ اپنے غلاموں سے کہہ کر خاموشی سے ان کے سامان میں ان کے دیے ہوئے پیسے واپس رکھوا دیے۔

اسی طرح کا معاملہ انھوں نے جیل میں کیا تھا۔ وہ جیل گئے تو وہاں دو قیدی اور لائے گئے۔ ان دونوں نے اپنے اپنے خواب کی تعبیر ان سے دریافت کی۔ آپ نے دونوں کو صحیح تعبیر بتا دی۔ جس کے مطابق ایک شخص کو سولی چڑھنا تھا اور دوسرے کو اپنے پرانے منصب یعنی ساقی گیری پر بحال ہونا تھا۔ اس ساقی سے انھوں نے یہ بھی کہا کہ تب جب قید سے رہا ہو جاؤ تو بادشاہ سے میرا معاملہ بیان کرنا کہ ایک بے گناہ کو بلا وجہ قید میں ڈال دیا گیا ہے۔ مگر وہ ساقی رہا ہونے کے بعد آپ کا معاملہ بھول گیا۔

کافی عرصہ بعد بادشاہ نے ایک خواب دیکھا جس کی تعبیر کوئی بھی بیان نہیں کر سکا۔ اس پر ساقی کو خوابوں کی سچی تعبیر بتانے والے یوسف یاد آ گئے۔ وہ بادشاہ سے اجازت لے کر آپ سے خواب کی تعبیر پوچھنے آیا۔ یہ وہ موقع تھا کہ آپ اس ساقی کو خوب سناتے، اسے شرمندہ کرتے کہ یہ احسان فراموش کس طرح رہائی کے بعد انھیں بھول گیا۔ مگر آپ نے ایک لفظ نہیں کہا۔ نہ صرف یہ کہ خواب کی صحیح تعبیر بتائی کہ سات برس بعد قحط پڑے گا بلکہ مسئلے کا حل بھی بتا دیا۔ یہ سیرت اور کردار بلاشبہ انسانیت کی معراج ہے جو نصیبے والوں ہی کو ملا کرتا ہے :

یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

یہی وہ سیرت و کردار ہے جو حضرات انبیا اور خاص کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا غیر معمولی وصف تھا۔ بدقسمتی سے آج کے مسلمان رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کا مطلب چند ظاہری اعمال کو اختیار کرنا سمجھتے ہیں۔ آپ کی سچی پیروی کا مطلب درحقیقت اِس سیرت و کردار اور اِس اخلاقی رویے کی پیروی کرنا ہے۔ یہ کردار بڑی ہمت کے بعد ہی پیدا ہوتا ہے لیکن ایک دفعہ پیدا ہو جائے تو دنیا انسان کے قدموں میں گر جاتی ہے۔

خدا کی عطا و بخشش کی بنیادیں

حضرت یوسف کے واقعے میں ایک اور بڑا اہم سبق ان بنیادوں کا بیان ہے جو بندے پر رب کی عطا کا سبب بن جایا کرتی ہیں۔ حضرت یوسف کے متعلق اللہ تعالیٰ نے اس واقعے میں بار بار یہ بات بیان کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر خصوصی فضل فرمایا۔ مگر ہر جگہ یہ بات واضح کی گئی ہے کہ اس بندۂ مومن نے قدم قدم پر ایمان، اخلاص، احسان، صبر اور تقویٰ کے ذریعے سے اپنا میرٹ ثابت کیا تھا۔ سورۂ یوسف کی آیات نمبر 90,56,57,24,22 میں قارئین یہ دیکھ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی عطا کو انھی اوصاف پر منحصر قرار دیا ہے جو سیدنا یوسف میں بدرجۂ اتم موجود تھیں۔ صبر، احسان اور تقویٰ و پاکدامنی سے متعلق واقعات تو میں بیان کر چکا ہوں، ان کے ایمان و اخلاص کے حوالے سے قرآن مجید کا سب سے اہم بیان یہ ہے کہ جیل میں دو قیدیوں نے ان سے اپنے خواب کی تعبیر دریافت کی۔ مگر جواب دینے سے قبل انھوں نے اختصار کے ساتھ مگر انتہائی پر اثر انداز میں توحید و ایمان کی دعوت کو ان کے سامنے رکھ دیا۔ یہ اس بات کا واضح اظہار ہے کہ ان کے نزدیک خدا سب سے اہم تھا اور اس کی توحید کی دعوت اور دوسروں کو اس کی طرف بلانا ان کے نزدیک کرنے کا سب سے بڑا کام تھا۔

یہی یوسف کریم کی سیرت ہے۔ دعوت گناہ کے موقع پر تقویٰ، حالات کے جبر پر صبر، بھائیوں کے ظلم کے جواب میں احسان اور توحید سے سچی وابستگی، یہی نیکی کی اصل بنیادیں ہیں۔ بدقسمتی سے آج کے مسلمانوں میں یہی بنیادیں بہت کمزور ہوچکی ہیں۔اس پر مزید یہ کہ پلاننگ، انکساری، عدل اور اعتماد کی وہ خصوصیات جو دنیا میں کامیابی کا لازمی تقاضا ہیں اور جو سیرتِ یوسفی کی جان ہیں، ان کی جگہ نری جذباتیت اور جلد بازی، بے جا فخر، خیانت، ظلم اور اعتماد سے محرومی مسلمانوں کے عام اوصاف ہیں۔اس کے بعد کیسے ممکن ہے کہ مسلمان خدا کی رحمتوں کے حقدار بنیں اور دنیا میں اعلیٰ مقام حاصل کریں۔

آج مسلمان جس بدحالی، پستی اور رسوائی کا شکار ہیں وہ کسی اور قوم کی سازش سے زیادہ مسلمانوں کی اپنی کوتاہیوں اور غلطیوں کا نتیجہ ہے۔آج مسلمان اگر سیدنا یوسف کی سیرت کو اپنالیں تو ان کے لیے دنیا اور آخرت کی نجات یقینی ہے۔خاص کر اس پس منظر میں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ صرف واقعاتِ زندگی کے لحاظ سے بلکہ سیرت و کردار میں بھی سیدنا یوسف جیسے تھے۔پیغمبر ویسے بھی بھائی ہوتے ہیں، مگر یہ دو بھائی کئی اعتبار سے بہت قریب ہیں۔ سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُونَ ۔وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِينَ ۔ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۔

علامہ اقبال کی خودکشی

حال ہی میں علامہ اقبال کے صاحبزادے ڈاکٹر جاوید اقبال کا ایک ٹی وی انٹرویو دیکھنے کا موقع ملا۔ان سے ملک کے موجودہ حالات کے پس منظر میں یہ سوال کیا گیا کہ آج علامہ اقبال زندہ ہوتے تو کیا کرتے۔اُنھوں نے بغیر کسی تردد کے ارشاد فرمایا کہ ان حالات (یہ تحریر 2010 زرداری صاحب کے دورحکومت کی ہے) کو دیکھ کر تو اقبال خودکشی کر لیتے۔

ڈاکٹر جاوید اقبال کی یہ مایوسی بلاوجہ نہیں ہے۔اہل پاکستان نے پچھلے کئی برس آمریت کے خلاف زبردست جدوجہد کی۔جس کے نتیجے میں ایک جمہوری نظام قائم ہوا۔عدلیہ کی آزادی اور اس کا تشخص بحال ہوا۔مگر بدقسمتی سے جمہوری حکومت کی کارکردگی اتنی خراب ثابت ہوئی ہے کہ ایک عام آدمی پرویز مشرف کے غیر جمہوری دور کو یاد کرنے پر مجبور ہوگیا ہے جب مہنگائی آج کے مقابلے میں کہیں کم تھی۔کرپشن کی کہانیاں تو پہلے بھی سامنے آتی رہی ہیں، مگر جس تواتر کے ساتھ قومی اداروں میں کرپشن اور ان کے دیوالیے پن کی خبریں پچھلے دو برس میں سامنے آئی ہیں اس کے نتیجے میں لوگوں کا اعتماد بری طرح مجروح ہوا ہے۔پھر ان سے بڑھ کر عدلیہ کے خلاف موجودہ حکومت کا رویہ وہی رہا ہے جو مشرف دور میں تھا۔

اس صورتحال میں ایک عام آدمی سے لے کر ڈاکٹر جاوید اقبال جیسے دانشور کا مایوس ہوجانا بظاہر ایک فطری عمل لگتا ہے۔لیکن میری ناقص رائے میں صورتحال جتنی بھی خراب ہو خودکشی کی

بات کرنا اور وہ بھی پسرِ اقبال کے منہ سے علامہ اقبال جیسے شخص کی خودکشی کی بات کا سامنے آنا شاید مناسب نہیں۔

نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر

میرے خیال میں اس موقع پر ضروری ہے کہ لوگوں کو یہ بتایا جائے کہ علامہ اقبال کون تھے اور ان کا طرزِ فکر کیا تھا اور یہ کہ علامہ اقبال جیسے عقاب صفت لوگ اتنے کمزور نہیں ہوتے کہ چند گِدھوں (خیال رہے یہ گِدھ کی جمع ہے گدھے کی نہیں) کو قوم کے تنِ نیم مردہ کو بھنبھوڑتا چھوڑ کر خودکشی کرلیں۔ اقبال کون تھے اور ان کا طرزِ فکر کیا تھا، اس کا اندازہ ایک واقعے سے کیا جاسکتا ہے۔

علامہ اقبال جس زمانے میں یورپ گئے تو ان کے صاحبزادے ڈاکٹر جاوید اقبال نے ان سے فرمائش کی کہ علامہ وہاں سے اِن کے لیے ایک باجہ لیتے آئیں۔ جواب میں علامہ نے ایک انتہائی خوبصورت نظم اپنے صاحبزادے کے نام لکھ بھیجی جس کا پہلا شعر ہی یہ تھا۔

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر
نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر

یہ ہے اقبال جو نوجوانوں کو اپنا زمانہ اور اپنی زندگی آپ تخلیق کرنے کی جدوجہد کرنے پر ابھارتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ دوسروں کے رحم و کرم پر جینے اور حالات کا نوحہ پڑھنے کے بجائے اپنی دنیا آپ پیدا کرو۔ یہی جذبۂ تخلیق زندگی کی اصل ہے۔

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سرِ آدم ہے ضمیرِ کن فکاں ہے زندگی
جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں
جنت تری پنہاں ہے تیرے خونِ جگر میں

اسی پس منظر میں میں یہ چاہتا ہوں کہ آج کی اس ملاقات میں اقبال کے پیغام پر کچھ بات کی جائے اور یہ بتایا جائے کہ کس طرح اقبال نے آج سے کہیں زیادہ بدتر حالات کا سامنا کیا اور پھر وہ کیا لائحہ عمل دیا جس کے نتیجے میں دنیا کی پانچویں اور عالم اسلام کی سب سے بڑی ریاست وجود میں آگئی۔ البتہ جگہ کی تنگی کے پیشِ نظر میں زیادہ اشعار نقل نہیں کروں گا۔ صرف ضروری مثالوں سے اپنی بات واضح کرنے کی کوشش کروں گا۔

اقبال کے زمانے کے حالات   علامہ اقبال نے انیسویں صدی کے آخر میں ہوش سنبھالا۔ یہ وہ دور تھا جب ان کے وطن پر برطانیہ کا راج تھا۔ یہ دنیا کی وہ طاقت تھی جس کا قبضہ دنیا کے تقریباً 84 فیصد حصے پر تھا۔ اس کی سلطنت پر سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔ مسلمانوں نے ہندوستان پر ہزار برس حکمرانی کی مگر 1857 کی بغاوت کے بعد وہ آخری درجے میں تباہ و برباد ہوچکے تھے۔ وہ برصغیر میں انگریزوں کے غلام تھے اور اُس ہندو اکثریت کے مقابلے میں چھوٹی سی اقلیت تھے جو تعداد کے علاوہ تعلیم، سیاست اور معیشت غرض ہر میدان میں ان سے آگے نکل چکی تھی۔ اقبال کی آنکھوں کے سامنے یہ واقعہ ہو رہا تھا کہ مسلمان اشرافیہ تیزی سے مغربی تعلیم کے ساتھ مغربی تہذیب و تمدن کے رنگ میں بھی ڈھلتی جارہی تھی۔ انھوں نے اپنے سامنے مشرقِ وسطیٰ میں مغربی اقوام کو مسلم ممالک کے حصے بخرے کرتے اور خلافت کا خاتمہ ہوتے دیکھا تھا۔ انھیں یہ بھی معلوم تھا کہ جس قوم میں وہ پیدا ہوئے ہیں وہ صدیوں سے ’کشتۂ سلطانی و ملائی و پیری‘ ہے۔ یعنی وہ آمریت، جمود پسند ملائیت اور بے عمل تصوف کی ماری ہوئی بھی ہے اور انھی کی دیوانی بھی ہے۔

تصورِ خودی

اقبال کو اگر خودکشی کرنی ہوتی تو وہ ان حالات کو دیکھ کر خودکشی کرلیتے۔ مگر اس کے برعکس

اقبال نے اپنے پورے شعور کے ساتھ اپنے دائرہ کار اور نصب العین کو متعین کیا۔ وکالت ان کا پیشہ، سیاست ان کے لیے قومی خدمت کا میدان اور شاعری ان کا مشن بن گئی۔ انھوں نے اپنی شاعری کو استعمال کرتے ہوئے قوم کو وہ پیغام دیا جو بیسویں صدی کے نصف اول میں ایک بہترین لائحہ عمل تھا۔ اس پیغام کی اساس کو ایک لفظ میں اگر بیان کیا جائے تو وہ تصور خودی تھی۔ یہ خودی کوئی پیچیدہ فلسفیانہ چیز نہیں، بہت سادہ حقیقت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان درخت اور پتھر نہیں ہے کہ حالات کے رحم و کرم پر زندگی گزار دے۔ بلکہ انسان اپنی ذات کا ایک شعور، اپنا ایک ذاتی ارادہ اور اختیار رکھتا ہے۔ جس کے نتیجے میں وہ اپنے حالات کا معمول نہیں بلکہ عامل ہے۔ وہ مجبور نہیں بلکہ آزاد ہے۔ اس کے پاس اختیار و ارادہ ہے جس کو استعمال کر کے وہ حالات کے رُخ کو موڑ سکتا ہے۔ وہ اپنی دنیا اور اپنا زمانہ اپنی مرضی سے تخلیق کر سکتا ہے۔

بیسویں صدی کی ابتدا میں ایک برباد اور بے اعتماد قوم کی خودی کو بیدار کرنے کے لیے انھوں نے اسے خود آگہی کا سبق پڑھایا۔ خاص طور پر قوم کے نوجوانوں اور اس کے باشعور طبقے کو انھوں نے مخاطب کیا اور ان پر یہ واضح کیا کہ وہ کس تہذیب و تاریخ کا حصہ ہیں۔ علم و عمل کی کس روایت سے ان کا تعلق ہے۔ چنانچہ وہ نوجوانوں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں۔

کبھی اے نوجواں مسلم تدبر بھی کیا تو نے
وہ کیا گردوں تھا جس کا تو ہے ایک ٹوٹا ہوا تارا
تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوش محبت میں
کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں سے تاجِ سرِ دارا

خودی اور خود آگاہی کا یہ ملن ان کے نزدیک انسان کے سارے جمال و کمال کی بنیاد ہے۔

خودی سے مردِ خود آگاہ کا ہے جلال و جمال
کہ یہ کتاب ہے باقی تمام تفسیریں

خودی کے فروغ کے لیے انھوں نے خود آگاہی کے ساتھ افراد ملت کو اعتماد و یقین کی دولت سے مالا مال کیا۔ کیونکہ اس اعتماد کے بغیر کوئی شخص اپنے حالات کو بدلنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ وہ اپنے اشعار میں جب جب یقین کی بات کرتے ہیں تو اس سے ان کی مراد خود اعتمادی اور اپنی قوت و صلاحیت پر بھروسہ ہوتا ہے۔ یہ خود اعتمادی گرچہ خود آگہی کا ایک فطری نتیجہ ہے، مگر وہ اکثر اپنی شاعری میں خاص طور پر اس کی طرف توجہ دلاتے ہیں اور اسے پیدا کرنے پر زور دیتے ہیں:

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
سن اے تہذیبِ حاضر کے گرفتار
غلامی سے ہے ابتر بے یقینی

اقبال نے خود آگہی اور یقین کے ساتھ تیسری چیز جو دی وہ امید کا درس ہے۔ یعنی انسان بدترین حالات میں بھی مایوس ہوئے بغیر اپنی جدوجہد جاری رکھے۔ وہ کہتے ہیں:

نہ ہو نومید نومیدی زوال علم و عرفاں ہے
امید مرد مومن ہے خدا کے راز دانوں میں

اقبال نے خودی کے اپنے اس پیغام اور خود آگہی، خود اعتمادی اور پر امیدی کی اساسات کو لے کر ایک پوری نسل پر محنت کی۔ آخر کار وہ مسلمانان برصغیر کے تن مردہ میں روح پھونکنے میں کامیاب ہو گئے۔ جس کے بعد وہ واقعہ رونما ہوا جس کا ذکر ہم نے شروع میں کیا تھا کہ ایک عظیم

ریاست دنیا کے نقشے پر نمودار ہوگئی۔

فکری لیڈر

اقبال ایک حقیقی فکری رہنما تھے۔ ایک حقیقی فکری رہنما کبھی سامنے نظر آنے والے حالات میں کھڑا ہو کر اپنا لائحہ عمل نہیں بناتا۔ نہ وہ اپنے اردگرد پھیلے مایوس کن حالات کو دیکھ کر دلبرداشتہ ہوتا ہے۔ یہ کام سیاستدان، صحافی اور دانشور کرتے ہیں۔ فکری لیڈر موجودہ نسل کا نہیں بلکہ اگلی نسل کا لیڈر ہوا کرتا ہے۔ اس کا منصوبہ مستقبل کے لیے ہوتا ہے اور اس کے نتائج بھی مستقبل ہی میں نکلا کرتے ہیں۔

ہمارا المیہ یہ ہے کہ اقبال کے بعد ہمارے ہاں کوئی بڑا فکری لیڈر سامنے نہیں آسکا۔ علم وفن اور فکر و دانش کی جتنی کچھ بھی روایت تھی وہ سیاست و صحافت کے کوچے کی نذر ہوگئی۔ یہی سبب ہے کہ ساٹھ برس سے زائد عرصہ بیت گیا مگر ہمارے مسائل نہ صرف یہ کہ جوں کے توں ہیں بلکہ ان میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔

آج کے حالات میں ضرورت اس بات کی ہے کہ مایوس کن حالات سے نظر ہٹا کر ایک نئے لائحہ عمل کے خدوخال واضح کیے جائیں۔ ہمارے نزدیک ہمارا سب سے قیمتی اثاثہ ہماری قوم کا تعلیم یافتہ مڈل کلاس اور اپر مڈل کلاس طبقہ ہے۔ اس طبقے کا ایک چھوٹا سا حصہ بھی اگر مایوس ہونے اور بے عملی اور مفاد پرستی اختیار کرنے کے بجائے قومی تعمیر کو اپنا مشن بنالے تو زیادہ عرصہ نہیں گزرے گا کہ صورتحال بدل جائے گی۔

اقبال کا فلسفہ

ہمارے نزدیک موجودہ حالات میں اقبال کی فکر کے بہت سے اجزا آج بھی ہماری رہنمائی کے لیے بہت اہم ہیں۔ حالات کے جس جبر کا ہم شکار ہیں اس سے نکلنے کے لیے ہمیں ان کے

تصور خودی کو دل و دماغ میں اتارنا ہوگا۔ یعنی مایوس ہوئے بغیر اس اعتماد کے ساتھ جدوجہد کرتے رہنا کہ ہم حالات کو بدل سکتے ہیں۔ ہم مجبور نہیں بلکہ اپنی قسمت کے آپ مالک ہیں۔ ہمیں اپنا زمانہ خود تخلیق کرنا ہے۔ یہی وہ سوچ ہے جسے اقبال 'عقابی روح' کہتے ہیں:

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے ان کو اپنی منزل آسمانوں میں

یہ روح اگر بیدار ہوجائے تو آسمان بھی انسان کے راستے کی گرد بن جایا کرتا ہے۔ البتہ یہ بات اہم ہے کہ قومی حیثیت میں ہمیں اپنے اہداف کو نئے سرے سے متعین کرنا ہوگا۔ اس سلسلے میں تین چیزیں بنیادی ہیں۔ اول یہ کہ ہمیں غیر مسلموں سے اپنے تعلقات کی نوعیت کو نئے سرے سے سمجھنا ہوگا۔ اقبال کے زمانے میں ہم نے غیر مسلموں کے مقابلے میں اپنے تاریخی فخر کو دریافت کیا تھا۔ یہ اعتماد سے محروم ایک غلام قوم کے لیے اُس دور کا ایک تقاضا تھا۔ مگر آج ضروری ہے کہ ہم غیر مسلموں کے معاملے میں اپنی ذمہ داری کو دریافت کریں۔

ہم یہ سمجھیں کہ ان کا ہم سے اصل تعلق دشمن کا نہیں مدعو کا ہے۔ ہمیں ان تک دین کی دعوت پہنچانی ہے۔ اس کے لیے تمام جھگڑوں کو یکطرفہ طور پر ختم کرنا ان کی نہیں بلکہ ہماری ذمہ داری ہے۔ ہمیں جنگ کے بجائے امن کی بات کرنی ہوگی۔ نفرت کے بجائے محبت کے تعلق کو جنم دینا ہوگا۔ اس کے نتیجے میں نہ صرف اسلام کی دعوت پھیلے گی بلکہ جوں جوں امن قائم ہوگا اس سے ہماری معاشی صورتحال بہت تیزی کے ساتھ بہتر ہوتی چلی جائے گی۔

دوسری چیز قومی سطح پر تعلیم کو اپنی سب سے بڑی ترجیح بنانا ہوگا۔ ہمیں اپنی تمام تر توانائی قوم کو تعلیم یافتہ بنانے پر صرف کرنا ہوگی۔ اس چیز کا ہماری قومی ترجیحات میں سب سے اوپر آنا ضروری ہے۔ تعلیم نہ صرف ہماری ترقی کی ضامن ہے بلکہ وہ ہمیں نااہل اور کرپٹ سیاستدانوں

کے چنگل سے بھی نجات دلائے گی۔ تعلیم کے بغیر بدترین لیڈر انتخابی عمل کے ذریعے ہم پر بار بار مسلط ہوتے رہیں گے اور ہم نہ آمریت کی کوئی خوبی دیکھ سکیں گے اور نہ جمہوریت ہی کا کوئی فائدہ ہمارے حصے میں آئے گا۔

تیسری چیز انفرادی سطح پر اخلاقیات کو اپنا سب سے بڑا مسئلہ بنانا ہوگا۔ جب کسی قوم میں اعلیٰ اخلاقی رویے ختم ہوجائیں، عدل، انصاف، ایمانداری، امانت، دیانت وغیرہ اجنبی ہوجائیں تو پھر بدترین لوگ قوم پر مسلط ہوجاتے ہیں۔ طبقاتی کشمکش شروع ہوجاتی ہے۔ قوم گروہوں اور ٹکڑوں میں بٹ کر خانہ جنگی کا شکار ہوجاتی ہے اور آخر کار تباہ و برباد ہوجاتی ہے۔

ان چیزوں کو لوگ اجتماعی اور انفرادی سطح پر اپنا مسئلہ بنالیں اور ایک نسل تک اس صبر کے ساتھ جدوجہد کی جائے تو پھر دنیا کی کوئی طاقت ہمیں ایک بہتر راستے پر جانے سے نہیں روک سکتی۔ الحمد للہ اب یہ جدوجہد شروع ہوگئی ہے۔ شعور پیدا ہورہا ہے اور آہستہ آہستہ لوگ اس قافلے میں شریک ہوتے جائیں گے۔ اور زیادہ وقت نہیں گزرے گا کہ ایک روشن مستقبل ہمارے سامنے ہوگا۔

مسائل یا چیلنج

اہل پاکستان کو ابتدا ہی سے بہت سے مسائل کا سامنا رہا ہے۔ قیام پاکستان کے ساتھ ہی مہاجرین کی آبادکاری، اثاثوں کی تقسیم پھر کشمیر اور دیگر مقبوضہ ریاستوں کے مسائل پیش آگئے۔ اس کے بعد غیر مستحکم جمہوریت، آئین کا نہ بننا، بیوروکریسی کا غلبہ، فوجی آمریت، بھارت سے مسلسل تصادم اور مشرقی پاکستان کی علیحدگی جیسے مسائل نے قوم کو گھیرے رکھا۔ بنگلہ دیش کی علیحدگی کے بعد پاکستان میں جمہوریت کا سفر شروع ہوا۔ مگر عدم برداشت کے ماحول نے جلد ہی جمہوریت کی بساط لپیٹ دی اور پھر افغان جنگ کا وہ المیہ شروع ہوا جس نے ملک کو اسلحے اور ہیروئن کا مرکز بنادیا۔ نوے کی دہائی کی کمزور جمہوریت میں کرپشن پھلی پھولی اور معیشت کا بیڑا غرق ہوا، جس کے بعد فوجی اقتدار نے ایک دفعہ پھر ملک کو اپنے شکنجے میں لے لیا۔

9/11 کے بعد کی دنیا میں بتدریج پاکستان کے لیے اندرونی اور بیرونی مسائل بڑھتے چلے گئے۔ سیاسی اور معاشی بحران، شمالی علاقوں میں خانہ جنگی، خودکش حملے، امن وامان کی ناقص صورتحال اور بدامنی، قتل، ڈاکوں اور اغوا کی کثرت، مہنگائی اور بدعنوانی، سیاستدانوں کی مفاد پرستی اور بدترین لوٹ مار، مذہبی انتہا پسندی اور دہشت گردی وغیرہ وہ چیزیں ہیں جن کا اخبارات اور ٹی وی پر روزانہ کا تذکرہ لوگوں کے اعصاب پر بدترین اثرات مرتب کرتا ہے۔ پھر سماجی سطح پر لڑکیوں کے رشتوں کا مسئلہ، خاندانی جھگڑے، بیماریوں کی کثرت، معیار زندگی بڑھانے کے

لیے مسلسل جدوجہد وغیرہ، ان سب چیزوں نے مل کر ہمیں ایک زبردست ذہنی اضطراب میں مبتلا کر دیا ہے۔ ہر طرف مایوسی اور ناامیدی کی فضا چھائی ہوئی ہے۔

ان تمام معاملات کو دیکھنے کا ایک انداز یہ ہے کہ یہ ہمارے مسائل ہیں جو ختم ہی نہیں ہوتے۔ مگر ان کو دیکھنے کا ایک دوسرا انداز یہ ہے کہ ہم مسلسل چیلنجز کا شکار ہیں۔ مسائل انسان کا حوصلہ پست کرتے ہیں، مگر چیلنج انسان کی قوتوں کو عمل کی دعوت دیتے ہیں۔ مسائل کو چیلنج کے روپ میں دیکھنے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ آدمی کا حوصلہ کبھی پست نہیں ہوتا۔ انسان چیلنج کے وقت اپنی چھپی ہوئی طاقتوں کو دریافت کرتا ہے۔ اس میں مایوسی کے بجائے عمل کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور انسان تھک کر بیٹھنے کے بجائے اپنی صلاحیتوں کو دریافت کرتا ہے جو ابھی تک اس کی نظر سے پوشیدہ تھیں۔ جس کے بعد انسان مسائل میں چھپے امکانات اور چیلنجز میں پوشیدہ ترقی کے امکانات کو دیکھنے کے قابل ہو جاتا ہے۔

تو اے مسافرِ شب خود چراغ بن اپنا

ہماری اصل بدقسمتی ہمارے مسائل نہیں بلکہ اس قیادت کا نہ ہونا ہے جو مسائل کو چیلنج کے روپ میں دکھا سکے۔ ہمارے ہاں بدقسمتی سے جو قیادت رہی ہے وہ سیاسی صورتحال کی اصلاح کو مسائل کا حل سمجھتی رہی ہے۔ اس اندازِ فکر کا نتیجہ ہے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ اگر امریکہ سپر پاور نہ رہے یا مشرف، زرداری یا اب نواز حکومت ختم ہو جائے تو ہمارے سارے مسائل حل ہو جائیں گے۔ یہ صورتحال کا انتہائی سطحی تجزیہ ہے۔ ہمارے مسائل اس سے کہیں زیادہ گہرے ہیں۔ بالفرض سیاسی تبدیلی آ بھی جائے تب بھی ہمارے معاملات میں ایک دم بہتری ممکن نہیں۔ سن پچاس کی دہائی سے آج تک چھ دہائیوں کا سبق یہ ہے کہ لوگ حکومت کی تبدیلی سے بہتری کی امید لگاتے ہیں۔ حکومت بدل جاتی ہے، مگر متوقع بہتری نہیں آتی۔

ہمارے مسائل کا اصل حل یہ ہے کہ ہماری قوم کے باشعور لوگ مایوسی کی اس سیاہ رات کو خود بدلنے کا فیصلہ کر لیں۔ وہ یہ بات جان لیں کہ مسئلے کا حل اصل میں ان کی ذات میں پوشیدہ ہے۔ انھیں خود کو بدلنا ہوگا۔ جب تک وہ اپنی ذات کی سطح پر بدل کر اپنے دفتر، گھر اور خاندان کی سطح پر نتائج پیدا نہیں کریں گے مسائل حل نہیں ہوں گے۔ مسئلہ صرف اور صرف ان کی سطح پر ہے۔ وہ اگر ٹھیک ہو گئے تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ انہیں اپنی اندھیری شب کے لیے کسی سورج کے طلوع کا انتظار ختم کر کے اپنی رات کا چراغ خود بننا ہوگا۔ یہ چراغ اپنی قوت ارادی، امید اور حوصلے سے جلتے ہیں نہ کہ نااہل دانشوروں کی مایوس کن تقریریں اور لیڈروں کے جذباتی بیانات سننے سے۔ میں اس بات کو اس طرح بیان کرتا ہوں کہ نادان اپنے حالات میں تبدیلی کے لیے خارج کے کسی انقلاب کا انتظار کرتے ہیں جبکہ عقلمند اپنی شخصیت کے اندر تبدیلی لا کر اپنے حالات بدل لیتے ہیں۔ یہ تبدیلی اکثر لوگ لے آئیں تو ساری قوم کے حالات بہتر ہو جائیں گے۔

یہ کیسے ہوگا؟

بہت سے لوگوں کو شاید میری یہ بات ایک تقریر لگے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ میری بات تاریخ انسانی کا سبق بھی ہے اور مذہب کی تعلیم بھی۔ ان سے بڑھ کر جدید سائنس بھی اب اس بات کے حق میں شواہد پیش کرنے لگی ہے۔

مذہب ہمیں جو اندازِ فکر دیتا ہے وہ ذاتی اصلاح کا ہے۔ وہ انسان کو اپنی ذات اور اپنے ماحول کی ذمہ داریوں کے بارے میں حساس بناتا ہے، قرآن پاک کی سورہ عصر میں اللہ تعالیٰ نے اسی بات کو بیان کیا ہے۔ قرآن کے بیان کردہ لائحہ عمل کو قبول کر لیا جائے تو اس کے بعد سوسائٹی میں انقلابی تبدیلی آنا لازمی ہے، جس طرح صحابہ کرام کے معاشرے میں انسانیت نے دیکھا کہ کس طرح عدل و انصاف کی حکومت قائم ہو گئی تھی۔

تاریخ بھی یہی بتاتی ہے کہ جب تک عام لوگ ٹھیک رہے حکومتوں کا تمام تر بگاڑ بھی معاشرے میں ایک حد سے زیادہ خرابی نہ پیدا کر سکا۔ یہ اس دور میں ہوا جب بادشاہت اور آمریت نے عوامی امنگوں کا اجتماعی سطح پر ظہور تقریباً ناممکن بنا رکھا تھا۔ جبکہ آج کے جمہوری دور میں لوگ اپنے حکمران بھی بدل سکتے ہیں۔ ایسے میں تو صورتحال ماضی کے مقابلے میں کہیں زیادہ بہتر ہوگی۔ میں اس بارے میں تاریخ اور مذہب کے پہلو سے پہلے بھی کئی دفعہ بات کر چکا ہوں۔ اس لیے آج میں ایک فرد کی طاقت اور خاص کر باشعور اور باارادہ افراد کی طاقت کو دور جدید کی سائنسی تحقیق کے حوالے سے بیان کروں گا۔

کوانٹم ورلڈ کا کرشمہ

دورجدید میں کائنات کے اسرار کے حوالے سے سائنسی ترقی کا ایک دور وہ ہے جو نیوٹن کی علمی تحقیقات سے متعلق ہے۔ اس دور میں کائنات کی تفہیم کے لیے Classical Newtonian Mechanics کے قوانین کو کافی سمجھ لیا گیا تھا۔ یہ نیوٹن کے زمانے کی وہ سائنس تھی جب اس دنیا کو آنکھوں سے نظر آنے والی دنیا یعنی فزیکل ورلڈ تک محدود سمجھ لیا گیا تھا اور اسی سے متعلق سائنسی قوانین جیسے حرکت کے قوانین وغیرہ کو ہر حقیقت کی وضاحت کے لیے کافی سمجھ لیا گیا تھا۔ تاہم اس کے بعد جدید سائنس نے ایک نئی دنیا دریافت کی۔ اسے کوانٹم ورلڈ (Quantum World) کہا جاتا ہے۔ یہ دنیا وہ ہے جو آنکھ سے نظر نہیں آتی۔ ایٹم کا نام تو سب نے سن رکھا ہوگا۔ یہ مادہ کی بنیادی اکائی ہے۔ یعنی اگر اشیا کو توڑتے چلے جائیں تو آخر میں جو ایک بالکل منفرد (Unique) ذرے سے بھی بہت چھوٹی چیز بچے گی وہ ایٹم ہوگا۔ ہر ایٹم ایک مرکزے (Nucleus) اور ارد گرد گھومتے ہوئے الیکٹرون اور کچھ دیگر ذرات پر مشتمل ہوتا ہے۔ جس طرح سورج کے گرد سیارے گھومتے ہیں اسی طرح مرکزے کے گرد الیکٹرون گھومتے ہیں۔ آنکھ

سے نظر نہ آنے والی یہ دنیا کوانٹم ورلڈ ہے جو ہر مادی چیز کو تخلیق کرتی ہے۔

مادی دنیا بظاہر دیکھنے میں مختلف نظر آتی ہے جیسے انسان، پہاڑ اور سمندر وغیرہ سب مختلف نظر آتے ہیں۔ مگر ان میں سے ہر چیز اسی کوانٹم دنیا سے مل کر بنتی ہے۔ اس اعتبار سے جو کوانٹم دنیا سمندر، ریت یا دیگر مخلوق کی بنیاد ہے وہی انسانوں کی تخلیق میں کارفرما ہے۔ یعنی ہر چیز کی تخلیق میں اللہ تعالیٰ نے ایک جیسے الیکٹرون استعمال کیے ہیں۔ بالکل ایسے ہی جس طرح لکڑی سے دروازہ بھی بنتا ہے اور میز بھی مگر دیکھنے میں دونوں مختلف لگتے ہیں۔

دور جدید میں ایک عظیم دریافت یہ ہوئی ہے کہ کسی نہ کسی طرح تمام الیکٹرون آپس میں متعلق ہوتے ہیں۔ یہ تصور entanglement کہلاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ الیکٹرون کی سطح پر ہمارے اپنے اندر موجود الیکٹرون باہر کی دنیا کے الیکٹرون سے جڑے ہوئے ہیں۔ جدید فزکس کے ماہرین کا ایک گروہ وہ ہے جو انسانی دماغ پر اپنے تجربات کی وجہ سے اس بات کا قائل ہو چکا ہے کہ الیکٹرون کی سطح پر اس entanglement کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ انسان جس طرح سوچتا ہے خارج کی دنیا لازماً اس کا اثر قبول کرتی ہے۔ انسان کا ارادہ اگر طاقتور ہو اور وہ فوکس کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو تو خارج کی دنیا ویسی ہونا شروع ہو جاتی ہے، جیسا کہ انسان سوچتا ہے۔ اگر انسان کمزور ارادے کا حامل ہو تو جیسی خارج کی دنیا ہوگی ویسا ہی انسان ہونا شروع ہو جائے گا۔

مذہبی تائید

دور جدید کی یہ سائنسی دریافت ہمارے مذہبی تصورات یا انسانی مشاہدات کے لیے کوئی اجنبی نہیں۔ انسانی تاریخ میں بہت سے ایسے لوگوں کا ذکر ملتا ہے جو لوہے کی بنی اشیا پر اپنی نگاہ مرکوز کر کے اس کو ٹیڑھا کر دیتے تھے۔ قرآن میں بھی ہمیں بعض ایسے واقعات ملتے ہیں۔ ایک

واقعہ ہاروت اور ماروت نامی ان دو فرشتوں کا ہے جن کا سکھایا گیا علم اتنا موثر تھا کہ ان کے ذریعے سے میاں بیوی کے مزاج میں ایسا اختلاف پیدا ہوتا کہ طلاق کی نوبت آجاتی (بقرہ 102:2)۔ دوسرا واقعہ حضرت سلیمان کے وزیر کا ہے۔قرآن کے مطابق ان کے دربار میں ایک جن نے یہ کہا کہ میں ملکہ سبا کا تخت دربار برخواست ہونے سے پہلے لاسکتا ہوں۔مگر ان صاحب کے پاس اللہ کے ایک خاص قانون کا علم تھا اور اسی کے زور پر وہ پلک جھپکتے ہی تخت دربار میں لے آئے،(نمل 40:27)۔

انسان کی طاقت

انسان کی سوچ اور نفسی طاقت کا یہ اظہار ہمیں بتاتا ہے کہ ہمارے لیے یہ عین ممکن ہے کہ ہم اپنے خارج کو اپنی مرضی کے مطابق بدل ڈالیں۔انسان کو اللہ تعالیٰ نے یہ صلاحیت دی ہے کہ وہ حالات کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالے۔شرط یہ ہے کہ انسان عزم کرے اور حالات کے دباؤ اور تقدیر پر شاکر ہونے کے بجائے خود اپنی تقدیر کا مالک بننے کی کوشش کرے۔

اس وقت ہمارا اصل المیہ یہ ہے کہ ہماری قوم کو مایوسی میں مبتلا کر کے اپنی اس اصل طاقت سے محروم کیا جارہا ہے جو اللہ تعالیٰ نے عطا کی ہے۔ایسے میں کم از کم میں ان لوگوں سے یہ توقع ضرور رکھتا ہوں جو میری تحریریں پڑھتے ہیں کہ وہ اپنے اندر کی طاقت کو پہچانیں اور کم از کم اپنی ذات اور قریبی ماحول کی سطح پر سب کچھ بدلنے کا عزم کرلیں۔اس کے بعد حیرت انگیز طور پر وہ دیکھیں گے کہ دنیا بدلنا شروع ہوگئی ہے۔

خدا کی دنیا لامحدود امکانات کی دنیا ہے۔اس دنیا میں مایوسی کا مطلب خدا کی ذات کا انکار ہے۔بلاشبہ یہ کفر ہے اور خدا کافروں کو راہ نہیں دکھایا کرتا۔مگر جو لوگ اللہ پر بھروسہ کرتے ہیں ان کے لیے نہ کوئی مایوسی کی بات ہوتی ہے اور نہ وہ حالات کے دباؤ کا شکار ہوتے ہیں۔وہ اپنے

حوصلے اور عزم سے اپنی دنیا آپ پیدا کرلیتے ہیں۔حالات ان کو بند گلی میں لے آتے ہیں،مگر وہ آسمان تک بلند رکاوٹوں کو عبور کرلیتے ہیں۔زندگی ان کے لیے اندھیروں کی خبر لاتی ہے اور وہ اپنے ایمان کو شمع کی طرح روشن کر کے ہر تاریکی کا سینہ چاک کردیتے ہیں۔لوگ ان پر مصائب کے دروازے کھول دیتے ہیں،مگر وہ اپنی استقامت اور عزم سے ہر مشکل کو آسانی میں بدل دیتے ہیں۔

خدا کی دنیا نے ہمیشہ ایسے لوگوں کو کامیاب و کامران دیکھا ہے۔مایوس اور ناامید لوگوں کا آخری انجام محکومی، بدحالی اور بربادی ہوتا ہے۔اب فیصلہ آپ کرلیجیے کہ آپ اپنے لیے کیا چاہتے ہیں۔خدا تو آپ کے لیے اپنے قوانین نہیں بدلے گا۔بدلنا آپ کو ہوگا۔یہی ہر بند تالے کی چابی ہے۔

طلاق اور خاندانی جھگڑوں کا حل؟

اس وقت ہمارا معاشرہ کئی اعتبار سے بحران کا شکار ہے۔معاشی،معاشرتی،سیاسی اور مذہبی حوالوں سے ہم طرح طرح کے مسائل کا شکار ہیں۔تاہم ان مسائل میں سے بہت سے ایسے ہیں جو ہم نے خود پیدا کیے ہیں۔ان میں سرفہرست مسئلہ خاندانی جھگڑوں کا ہے۔یہ جھگڑے عام طور پر میاں بیوی اور ساس بہو کے حوالے سے آئے دن ہمارے سامنے آتے رہتے ہیں۔ان کی سنگینی کئی اعتبار سے تباہ کن ہوتی ہے۔سب سے پہلے یہ ایک خاندن کے تمام افراد کا ذہنی سکون برباد کردیتے ہیں۔جس کے نتیجے میں زندگی کے دیگر معاملات بھی متاثر ہوتے ہیں۔یہ جھگڑے جب طول کھینچتے اور آئے دن کا معمول بنتے ہیں تو بچوں پر شدید نوعیت کے نفسیاتی اثرات مرتب کرتے ہیں۔یہ اثرات تازیست ان کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔پھر جب ایسے جھگڑوں کے نتیجے میں خاندان جدا ہوتے ہیں،میاں بیوی میں علیحدگی ہوتی ہے تو ہر متعلقہ شخص کی زندگی اس سے شدید طور پر متاثر ہوتی ہے۔اس لیے آج کی ملاقات میں یہ چاہتا ہوں کہ اس مسئلے پر تفصیل سے بات کرلی جائے۔

میں واضح کردوں کہ کسی خاص گھر میں پیدا ہونے والے جھگڑے کے بارے میں کوئی اصولی بات بتانا ممکن نہیں۔اس کا سبب یہ ہے کہ ہر جگہ کے معاملات مختلف ہوتے ہیں۔ہر انسان اپنی تربیت،طبیعت اور عادت میں جدا ہوتا ہے،اس لیے کوئی اصولی بات تو نہیں کہی

جاسکتی کہ کس جگہ جھگڑے کی وجہ کیا ہوتی ہے البتہ کچھ عمومی باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا خیال اگر رکھا جائے تو معاملات خراب ہونے سے بچ سکتے ہیں۔

ایڈجسٹمنٹ کی تربیت

عام طور پر ہمارے ہاں اس طرح کے مسائل کا آغاز شادی کے فوراً بعد ہوجاتا ہے۔اس کا سبب ایک بنیادی حقیقت کو نظرانداز کرنا ہوتا ہے۔وہ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے معاشرتی پس منظر میں شادی کے بعد لڑکی کو اپنا گھر چھوڑ کر سسرال میں جاکر رہنا ہوتا ہے۔ایک لڑکی کے لیے یہ نئی زندگی کا آغاز ہوتا ہے،اس کے ذہن میں اپنے گھر اور اپنے شوہر کے ساتھ زندگی گزارنے کا ایک تصور ہوتا ہے۔مگر حقیقت یہ ہوتی ہے کہ وہ لڑکی ایک مرد کی بیوی کم اور ایک دوسرے خاندان کی بہو زیادہ ہوتی ہے۔یہ بات کتنی ہی ناپسندیدہ کیوں نہ ہو،مگر بہرحال یہ ہمارے ہاں کی ایک معاشرتی حقیقت ہے۔

اس حقیقت کا مطلب یہ ہے کہ وہ لڑکی اپنے شوہر کے ساتھ مل کر ایک نئی زندگی شروع نہیں کررہی ہوتی بلکہ ایک خاندان کا حصہ بن رہی ہوتی ہے۔اس خاندان کے کچھ طور طریقے ہوتے ہیں، ملنے جلنے اور لینے دینے کے آداب ہوتے ہیں،تعلقات کا ایک دائرہ ہوتا ہے،رہنے سہنے اور کھانے پینے کا ایک طریقہ ہوتا ہے،معاملات کو کرنے کا ایک انداز ہوتا ہے۔جبکہ آنے والی لڑکی،چاہے رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو،اکثر ایک مختلف پس منظر سے آتی ہے۔اب اگر وہ لڑکی اس حقیقت کو سمجھ لیتی ہے اور خود کو نئے حالات میں ایڈجسٹ کرنے کی کوشش کرتی ہے تو زیادہ مسئلہ نہیں ہوتا۔لیکن جیسے ہی وہ اس حقیقت کو نظرانداز کرکے اپنی مرضی کی زندگی گزارنا چاہتی ہے تو جھگڑے فساد کا شروع ہونا لازمی ہے۔

یہ بنیادی حقیقت ہے جسے ہر والدین کو اپنی بیٹی کو واقف کرانا چاہیے کہ ہماری سوسائٹی

مغرب یا عرب معاشرے کی طرح نہیں جہاں لڑکا اور لڑکی اپنی زندگی کا آغاز کرتے ہیں۔ ہماری سوسائٹی میں لڑکی کو شوہر کے ساتھ سسرال کے طور طریقوں کے مطابق ایڈجسٹ ہونے کا ملکہ حاصل ہونا چاہیے۔ جس لڑکی کو اس بات کی سمجھ ہوتی ہے، وہ عام طور پر بہت کامیاب زندگی گزارتی ہے۔

بیٹی اور بہو

ایڈجسٹمنٹ اگر نئی آنے والی لڑکی کی ذمہ داری ہے تو بہرحال سسرال والوں کو بھی یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ یہ لڑکی اپنا گھر بار اور رشتہ دار چھوڑ کر ایک نئی زندگی کا تصور لے کر اِس گھر میں آئی ہے۔ اسے فوری طور پر احتساب کی سولی پر چڑھا دینا زیادتی ہے۔ اسے موقع ملنا چاہیے کہ وہ نئے حالات میں ایڈجسٹ کر سکے۔ اس دوران میں اس سے غلطیاں ہوں گی، وہ بھول کا شکار بھی ہوگی اور ہوسکتا ہے کہ وہ کوئی ناپسندیدہ معاملہ بھی کر بیٹھے لیکن اسے رعایت ملنی چاہیے۔

بدقسمتی سے ہمارے ہاں اکثر ایسا نہیں ہو پاتا ہے۔ عام طور پر ایک ساس خود برے حالات سے گزری ہوتی ہے۔ اس نے اپنی سسرال اور ساس کی طرف سے اچھے معاملات نہیں دیکھے ہوتے، اس لیے وہ طے کر لیتی ہی کہ وہی کچھ بہو کے ساتھ بھی لازماً ہونا چاہیے۔ مگر زمانہ چونکہ بیس پچیس سال آگے بڑھ چکا ہوتا ہے اس لیے ساس کے برخلاف نئے زمانے کی بہو زبردست مزاحمت کرتی ہے اور پھر جھگڑے ہو جاتے ہیں۔

مثلاً اگر ایک خاتون کو اس کی ساس نے میکے جانے سے روکا ہوتا ہے تو وہ بھی اکثر یہی کچھ اپنی بہو کے ساتھ کرتی ہے۔ اسی طرح اگر اس پر کام کاج کا تمام بوجھ ڈال دیا گیا ہوتا ہے تو وہ یہی کچھ اپنی بہو کے ساتھ بھی کرتی ہے۔ حالانکہ اس مسئلے کو دیکھنے کا ایک دوسرا رخ بھی ہے۔ وہ یہ کہ جو کچھ اس خاتون کے ساتھ ہوا ہے، اگر وہ اس وقت اس کے لیے برا تھا تو بیس پچیس سال

بعد اس نئے زمانے کی لڑکی کے لیے یہ زیادہ ناپسندیدہ ہوگا۔ پھر سب سے بڑی بات جو یاد رکھنی چاہیے وہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں کی خواتین بیٹیوں اور بہوؤں کے لیے الگ الگ معیار قائم کر لیتی ہیں۔ حدیث میں یہ بات کہی گئی ہے کہ جو اپنے لیے پسند کرو وہی اپنے بھائی کے لیے پسند کرو۔ یہ بات اگر خواتین ذہن میں رکھیں تو وہ جان لیں گی کہ وہ جو اپنی بیٹی کے لیے چاہتی ہیں، وہی انہیں دوسرے کی بیٹی کے لیے بھی، جو اب ان کی بہو ہے، پسند کرنا چاہیے۔ ان کے یا ان کی بیٹی کے ساتھ اگر کوئی زیادتی ہوئی ہے تو اس کا بدلہ اس نئی لڑکی سے لینا مناسب نہیں ہے۔ ظلم اگر ان کے ساتھ ہوا ہے، طنز و تعریض کے تیر اگر انھوں نے سہے ہیں، ماں باپ کی جدائی کا غم اگر انھوں نے اٹھایا ہے، شوہر کی بے رخی کا صدمہ اگر انھوں نے سہا ہے تو اس میں اس لڑکی کا کوئی قصور نہیں ہے کہ ان تمام چیزوں کا حساب اس نئی لڑکی سے لیا جائے۔ بلکہ ان کی یہ ذمہ داری ہے کہ اس کے ساتھ اچھا سلوک کر کے ایک بہتر روایت کا آغاز کریں۔

سب کو شیئر کرنا ہوگا

گھریلو جھگڑوں کا ایک اہم سبب اکثر وہ مرد بن جاتا ہے جو ایک طرف ایک خاتون کا شوہر ہوتا ہے اور دوسری طرف وہ ایک طویل عرصے سے کسی اور کا بیٹا اور بھائی ہوتا ہے۔ جھگڑے کا سبب بارہا یہ ہوتا ہے کہ اس مرد پر کس کے حقوق زیادہ ہیں۔ بیوی کے یا ماں کے۔ اس مسئلے کا حل صرف یہی ہے کہ ہر شخص کو کچھ نہ کچھ قربانی دینی چاہیے۔ لڑکی کو یہ بات جان لینی چاہیے کہ جو لڑکا آج اس کا شوہر بنا ہے، وہ عرصے سے ایک دوسری خاتون کا بیٹا اور کسی اور کا بھائی بھی ہے۔ انھوں نے اسے پالا پوسا اور پڑھایا لکھایا ہے۔ اس لیے اس شخص پر ان لوگوں کے حقوق بہت زیادہ ہیں۔ اس لیے ان پر کبھی اعتراض نہیں کرنا چاہیے۔ اسی طرح سسرال والوں کو بھی یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ میاں بیوی کی ایک پرائیویسی ہوتی ہے۔ انہیں ہر وقت اپنی نگرانی میں رکھنا،

بیوی کو میاں سے دور کرنے کی کوشش کرنا، ان کے ذاتی معاملات میں مداخلت کرنا ایک غیر فطری عمل ہے، جس کا نتیجہ اچھا نہیں نکلتا۔

اسی طرح بچوں کے معاملات بھی نااتفاقی کا سبب بنتے ہیں۔ نئی لڑکیاں اپنے ڈھنگ سے بچوں کو پالنا چاہتی ہیں اور پرانی خواتین اپنے تجربے اور پسند وناپسند کو درست سمجھتی ہیں۔ دادی لاڈ کرتی ہیں اور ماں سمجھتی ہے کہ بچہ بگڑ رہا ہے۔ ماں کسی وجہ سے بچے کی پٹائی کرتی ہے اور دادی کے نزدیک یہ ظلم ہوتا ہے۔ ان چیزوں کا حل آسان نہیں ہوتا کیونکہ ہر شخص اپنا حق زیادہ سمجھتا ہے۔ اہم بات یہی ہے کہ ہر فریق کو دوسرے کا حق تسلیم کرکے ایڈجسٹمنٹ کی راہ اختیار کرنی چاہیے۔

میاں بیوی کے اختلاف

بارہا ایسا ہوتا ہے کہ میاں بیوی کے مزاج اور عادات نہیں مل پاتیں۔ یعنی جھگڑے کے اصل فریق وہی دونوں بن جاتے ہیں۔ اس کا ایک سبب اکثر یہی ہوتا ہے کہ لڑکے کی ماں اور بہنیں خود فریق بننے کے بجائے اس لڑکے کے کندھے پر رکھ کر بندوق چلاتی ہیں۔ یعنی بھائی اور بیٹے کے سامنے لڑکی کی شکایات کرنا، اس کے عیوب گنوانا اور اس کی زیادتیوں کا رونا رونا۔ اسی طرح بیوی بھی گھر آتے ہی میاں کے سامنے شکایات کی پٹارا کھول دیتی ہے۔ لڑکا اگر ماں باپ اور بہن بھائیوں کا دفاع کرتا ہے تو اس پر بھی جھگڑا ہو جاتا ہے۔

اس کے علاوہ پسند کی شادی بالعموم میاں بیوی کے اختلاف کو جنم دیتی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ محبت برابری کا تعلق ہے۔ بلکہ اس میں مرد کو ذرا نیچے ہی رہ کر فریق مخالف کے ناز نخرے اٹھانے پڑتے ہیں۔ جب کہ میاں بیوی کا رشتہ برابری کا نہیں ہے۔ قرآن مجید بالکل واضح ہے کہ اس رشتے میں گھر کی سربراہی مرد کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ بیوی کو اس کی اطاعت کرنی

چاہیے۔ ہمارا معاشرہ بھی اسی اصول کو تسلیم کرتا ہے۔ جبکہ فلمیں اور ڈرامے دیکھ کر جوان ہونے والی خاتون توقع رکھتی ہے کہ تعلقات کی وہی سطح برقرار رہے گی جو شادی سے پہلے لوافیئر کے وقت تھی۔ یہ فطری طور پر نہیں ہوتا۔ اس سے محبت کا تعلق کم ہو جاتا ہے اور فساد پیدا ہوتا ہے۔

ہمارے ہاں اکثر مرد اپنی طاقت کا غلط استعمال بھی کرتے ہیں۔ وہ صرف اپنے حقوق سے واقف ہوتے ہیں۔ بیوی کا کوئی حق انہیں نظر نہیں آتا۔ وہ جب چاہتے ہیں اس کی پٹائی کر دیتے ہیں، میکے جانے سے روک دیتے ہیں، اس کی کمزوریوں پر اسے رسوا کرتے ہیں، اس کے ساتھ بدکلامی کرتے ہیں۔ حالانکہ دین نے اگر عورت سے اطاعت کا مطالبہ کیا ہے تو مرد پر یہ بات واضح کر دی ہے کہ ان پر احسان اور درگزر کا رویہ اختیار کرنا واجب ہے۔ اگر وہ ایسا نہیں کریں گے خدا کے حضور مجرموں کی طرح پیش ہوں گے۔ دین نے میاں اور بیوی کو جو تعلیم دی ہے اگر دونوں اس پر عمل کریں تو میاں بیوی کا رشتہ، جو اصل میں محبت کا رشتہ ہوتا ہے، اس میں نفرت نہیں در آسکتی۔

اخلاقی اصولوں کی پیروی

خاندانی جھگڑوں کے اسباب تو بے گنتی بیان کیے جاسکتے ہیں، مگر اصل مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ متعلقہ فریقین میں سے ہر ایک اخلاقی اصولوں کی خلاف ورزی کی بنیاد پر زندگی گزار رہا ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں لوگوں کی تحقیر کرنا، ان کا مذاق اڑانا، بدگمانی، تجسس، غیبت، چغل خوری اور بہتان تراشی وغیرہ سرے سے کوئی اخلاقی برائیاں سمجھی ہی نہیں جاتیں۔ ہماری خواتین کی باہمی گفتگو کا اگر کبھی تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اکثر گفتگو انہی چیزوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ یہی وہ چیزیں ہیں جو دلوں میں نفرت اور نااتفاقی کا بیج بوتی ہیں۔ لوگوں میں جدائی ڈلواتی اور خاندانوں کو تباہ کر دیتی ہیں۔

اوپر ہم نے میاں بیوی کے جن اختلافات کو بیان کیا ہے اس کا سبب ٹھیک یہی چیزیں ہیں۔یعنی تمام فریقین اپنی انا اور ہٹ دھرمی پر جم جاتے ہیں۔دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے تمام اخلاقی حدود پار کر کے اسے برا بنانے کی کوشش کرتے ہیں اور اس عمل میں ان تمام اخلاقی برائیوں کو اختیار کر لیتے ہیں،جن کے بعد کسی شخص کو آخرت کی کامیابی نصیب نہیں ہوسکتی۔

اس مسئلے کا حل یہی ہے کہ دین بتانے والے اہل علم لوگوں کو یہ سمجھائیں کہ اصل دین انہی اخلاقی اقدار کی پابندی ہے۔اس کے بغیر انسانوں کے دیگر نیک اعمال بھی ضائع ہوجاتے ہیں۔

طلاق کا قانون

ایک آخری بہت اہم بات یہ بیان کرنا ضروری ہے کہ اگر معاملات اتنے خراب ہوجائیں کہ دل سے محبت ہی ختم ہوجائے اور نوبت طلاق تک آجائے تو پھر مرد کو دین کے قانون کے مطابق اس حق کو استعمال کرنا چاہیے۔بلکہ میرا خیال ہے کہ طلاق دینے کے طریقہ کار کو تو اسکولوں کے نصاب میں شامل کر دینا چاہیے۔کیونکہ اس طریقے سے واقف نہ ہونے کے نتیجے میں اتنے زیادہ سنگین مسائل پیدا ہوتے ہیں جن کی کوئی حد نہیں۔ہمارے سامنے تو دن رات یہ سارے مسائل آتے رہتے ہیں جن میں لوگ اپنی بیویوں کو تین طلاقیں دے دیتے ہیں اور پھر جگہ جگہ بھاگتے پھرتے ہیں کہ اب کیا کریں۔

اس ضمن میں دین کا قانون اس قدر خوبصورت ہے بے اختیار داد دینے کو دل چاہتا ہے۔ اس قانون کو ہر فرقہ اور مسلک کے لوگ صحیح قانون مانتے ہیں۔اس قانون کے مطابق جب نکاح ختم کرنا ہو تو ایک مرد سب سے پہلے یہ دیکھے کہ آیا اس کی بیوی ایام سے پاک ہے۔اگر ہے تو دوسری چیز یہ دیکھے کہ کیا اس پاکی کی حالت میں میاں بیوی کا تعلق قائم ہوا ہے۔اگر ہوا ہے تو اگلے ایام کا انتظار کرے اور جب بیوی پاک ہوجائے تو اس پاک حالت میں جبکہ میاں بیوی کا

تعلق قائم نہ ہوا ہو بیوی کو ایک دفعہ طلاق دے دے۔

اس کے بعد تین حیض تک وہ عورت عدت میں رہے گی۔عدت کی یہ مدت اسے شوہر کے گھر میں گزارنی ہوگی،سوائے اس کے کہ وہ بدکاری کی مرتکب ہوئی ہو۔ورنہ خاتون گھر چھوڑے گی نہ شوہر ہی اسے گھر سے نکال سکتا ہے۔یہ تقریباً تین ماہ کی مدت بنتی ہے جس میں امید یہی ہوتی ہے کہ کوئی غلط فہمی یا وقتی غصہ ہے تو وہ باقی نہیں رہے گا۔چنانچہ دوران عدت اگر تعلقات ٹھیک ہوجائیں تو دونوں اطمینان سے ساتھ رہ سکتے ہیں۔اسے رجوع کہتے ہیں۔لیکن صورتحال یہی رہتی ہے تو تین ماہ بعد بیوی اور شوہر میں علیحدگی ہوجائے گی اور پھر عورت کا حق ہوگا کہ جہاں چاہے شادی کر لے۔یہ خیال رہے کہ چاہے طلاق دی جائے یا رجوع کیا جائے قرآن مجید کا حکم یہ ہے کہ یہ دو گواہوں کی موجودگی میں ہونا چاہیے(طلاق 2:65) تاکہ کوئی فریق بعد میں غلط بیانی نہ کرسکے۔

طلاق کے بعد اگر مرد تین ماہ میں رجوع کر لیتا ہے تو دونوں دوبارہ میاں بیوی کے طور پر اطمینان سے رہ سکتے ہیں۔دوبارہ زندگی میں کبھی پھر اسی نوعیت کا اختلاف ہو تو پھر یہی عمل دہرایا جائے۔مرد دوسری دفعہ بھی ایک طلاق دے کر چاہے تو تین ماہ میں رجوع کرسکتا ہے اور دونوں اطمینان سے ساتھ رہ سکتے ہیں۔البتہ مرد نے تیسری دفعہ پھر طلاق دے دی تو اب مرد کسی صورت اس عورت سے رجوع نہیں کرسکتا۔سوائے اس کے کہ عورت کسی اور سے نکاح کرے،پھر دوسرا شخص بھی اسے طلاق دے یا پھر اس کا انتقال ہوجائے۔ اسی شکل میں وہ مرد اس خاتون سے دوبارہ نکاح کرسکتا ہے،(طلاق 2:230)۔

یہ ہے دینی تعلیمات میں تین طلاق کا مطلب۔یہ نہیں کہ جب بھی طلاق دینی ہو تین دفعہ طلاق کا لفظ زبان سے ادا کریں۔قرآن مجید کے مطابق طلاق ایک وقت میں ایک ہی دفعہ دینی

چاہیے۔اس ایک دفعہ طلاق کہنے والے طریقے کی خوبصورتی یہی ہے کہ تین ماہ میں جھگڑا ختم ہوجائے تو ساتھ رہ لیں۔تین ماہ بعد عورت آزاد ہے کہ جہاں چاہے شادی کرے۔سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ سال دوسال بعد بھی غلطی کا احساس ہوتو یہ دونوں مرد وعورت ایک دفعہ پھر نکاح کر کے نئے سرے سے زندگی شروع کرسکتے ہیں۔

بدقسمتی سے ہمارے ہاں طلاق کا مطلب تین طلاق ہوتا ہے۔یعنی جس شخص کو طلاق دینی ہوتی ہے وہ تین دفعہ ہی طلاق کا لفظ بولتا ہے۔یہ اللہ کے حکم کی خلاف ورزی اور ایک گناہ کبیرہ ہے۔جس کے بعد لوگ حلالہ کرواتے ہیں یا روتے رہتے ہیں۔حالانکہ دین کے طریقے کو اختیار کیا جائے تو کبھی کوئی مسئلہ نہ ہو۔طلاق دینے پر پشیمانی ہوجائے یا بچوں کے مستقبل کا خیال دامن گیر ہو، ہرصورت میں میاں بیوی دوبارہ ساتھ رہ سکتے ہیں۔یہی وہ طریقہ ہے جسے امت متفقہ طور پر درست سمجھتی ہے۔یہی طریقہ قرآن پاک میں بیان ہوا ہے اور یہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سکھایا ہے۔احناف اسے احسن کہتے ہیں اور باقی ائمہ کے نزدیک یہ سنت طریقہ ہے۔اس لیے ہر مسلمان کے علم میں یہی طریقہ ہونا چاہیے اور خدانخواستہ کبھی طلاق کی نوبت آئے تو اسی طریقے کو اختیار کرنا چاہیے۔اس سے کوئی شرمندگی ہوگی اور نہ کوئی پچھتاوا اور ٹوٹا ہوا خاندان بھی دوبارہ جڑ سکتا ہے۔

معجزوں کا دور

گزشتہ ماہ رمضان میں مجھے تراویح کے بعد قرآن کریم کے ترجمہ ومختصر تفسیر کی خدمت سرانجام دینی پڑی۔رمضان مبارک کے حوالے سے میرا اپنا رجحان یہ ہے کہ اس مہینے میں انسان کی توجہ تنہائی کی عبادات کی طرف زیادہ ہونی چاہیے۔مگر اب ہمارے ہاں یہ مسئلہ ہو چکا ہے کہ سال بھر مساجد اور عبادت سے دور رہنے والے لوگ اسی مہینے میں ان کا اہتمام کرتے ہیں۔ایسے میں قرآن کریم کی دعوت لوگوں تک پہنچانے کا ایک آسان ذریعہ بہرحال رمضان میں حاصل ہوجاتا ہے۔یہی وہ چیز تھی جس کی بنا پر مجھے رمضان کریم میں اس بھاری ذمہ داری کو اٹھانا پڑا۔

تاہم میں ہمیشہ لوگوں اور خاص کر اہل علم کی توجہ اس طرف دلاتا ہوں کہ رمضان کا مہینہ دراصل تنہائی میں اپنے رب سے لو لگانے کا مہینہ ہے۔اسی لیے اعتکاف کی وہ عبادت اس ماہ مقدسہ میں مشروع کی گئی جو دنیا بھر سے کاٹ کر انسان کو خدا سے جوڑ دیتی ہے۔چنانچہ جس شخص کے لیے ممکن ہواُسے چاہیے کہ اس مہینے میں دنیا سے کٹ کر اپنے رب سے لو لگائے۔

مائیکروفون کا کرشمہ

رمضان سے تقریباً ایک ماہ قبل مجھے ایک مسئلہ پیش آ گیا تھا جس نے پورے رمضان میرے لیے انتہائی تکلیف دہ صورتحال پیدا کیے رکھی۔وہ یہ کہ میرے گلے اور بولنے کے نظام سے متعلق بعض عضلات میں کچھ تکلیف پیدا ہونے کی بنا پر میرے لیے گفتگو کرنا بہت مشکل ہوگیا۔میں

نے متعدد اسپیشلسٹ کو دکھایا۔حتیٰ کہ Endoscopy تک کرانے کی نوبت پیش آ گئی۔مگر کوئی افاقہ نہیں ہوا۔حالانکہ اس تکلیف سے نجات پانے کے لیے میں روزانہ تقریباً درجن بھر گولیاں کھاتا رہا تھا۔

خیر اسی حال میں رمضان مبارک شروع ہو گیا۔میرے لیے تو بولنا ناممکن تھا، روزانہ ایک گھنٹے تقریر کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔میرا خیال یہی تھا کہ میں ایک آدھ دن تک کسی نہ کسی طرح تقریر کرلوں گا، مگر اس کے بعد لازماً مجھے رکنا پڑے گا۔اس اندیشے کے باوجود میں نے اللہ کا نام لے کر اس کام کا آغاز کیا اور اس کی عنایت سے یہ ممکن ہو گیا کہ پورے رمضان میں قرآن مجید کا ترجمہ و خلاصہ لوگوں کے سامنے میں بیان کر سکا۔عالم اسباب میں، تاہم، اللہ تعالیٰ نے جس چیز کو اس ناممکن واقعے کو ظہور میں لانے کا ذریعہ بنایا وہ مائیکروفون سسٹم تھا۔میرے زیر استعمال جو سسٹم تھا وہ انتہائی جدید اور معیاری تھا۔جس کی بنا پر یہ ممکن ہوا کہ اسٹینڈ کے سہارے مائیک میرے منہ کے قریب رہتا اور میں بمشکل سرگوشی کے انداز میں گفتگو کرتا۔یہ سرگوشی اتنی ہلکی ہوتی کہ میرے برابر بیٹھا ہوا شخص بھی اس کو نہیں سن سکتا تھا۔مگر مائیکروفون سسٹم میری اس سرگوشی کو ایک بھرپور اور زوردار آواز بنا کر سامعین تک پہنچا دیتا۔یوں لوگ میری بات اطمینان کے ساتھ سنتے رہے۔گو اس طرح سرگوشی کرنے کے نتیجے میں بھی میرے گلے کی تکلیف بہت بڑھ جاتی اور اس تقریر کے علاوہ باقی وقت میں خاموش رہتا اور گھر والوں سے بھی اشارے کنائے میں بات کرتا۔ تاہم الحمدللہ جو ذمہ داری تفویض کی گئی تھی اسے میں پورا کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

معجزوں کا دور

جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ مجھے یقین تھا کہ میں اس کام کو نہیں کر سکوں گا اور ابتدا ہی میں مجھے سامعین اور منتظمین سے معذرت کرنی پڑ جائے گی۔لیکن جب آخری عشرہ آیا اور مجھے

احساس ہوا کہ اب یہ ممکن ہو چکا ہے تو میں نے پروردگار عالم کا بہت شکر ادا کیا۔لیکن اس کے ساتھ ہی میرا دل انسانیت کے لیے بھی شکر گزاری کے احساس سے بھر گیا۔کیونکہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تو ہمیں یہ سکھایا ہے کہ جو شخص انسانوں کا شکر گزار نہیں وہ رب کا بھی شکر گزار نہیں ہو سکتا۔میرے دل میں ان تمام لوگوں کے لیے احسان مندی کے جذبات پیدا ہو گئے جنھوں نے انسانیت کو نہ صرف مائیکروفون بلکہ اس جیسی دیگر تمام مفید چیزیں دیں۔

میں نے مزید غور کیا تو مجھ پر واضح ہوا کہ دور جدید معجزوں کا دور ہے۔تمام شعبہ ہائے زندگی میں انسان نے اتنی ترقی کی ہے کہ زمانۂ قدیم کا انسان اس کا تصور کرنے سے بھی قاصر تھا۔میں چند مثالوں سے اپنی بات واضح کرتا ہوں۔میں دو دن قبل اسلام آباد سے کراچی آیا۔یہ تقریباً بارہ سو کلومیٹر کا سفر ہے جو بذریعہ ہوائی جہاز دو گھنٹے سے بھی کم وقت میں طے ہو گیا۔یہ سفر زمانۂ قدیم کے انسان کے لیے ہفتوں بلکہ شاید مہینوں کا سفر تھا۔اسی طرح امریکہ کینیڈا کا سات ہزار کلومیٹر کا سفر اب ایک دن سے بھی کم وقت لیتا ہے۔سفر سے ہٹ کر ایک اور مثال لیجیے۔آج کے دور میں فون، انٹرنیٹ اور ٹی وی وغیرہ کے ذریعے ہزاروں میل دور موجود لوگ ایک دوسرے کے ساتھ بالکل ایسے گفتگو کر سکتے ہیں جیسے آمنے سامنے بیٹھے ہوں۔فاصلوں سے ہٹ کر ذرا علاج معالجے اور صحت کے مسئلے کو لیجیے۔اس شعبے میں جو ترقی ہوئی ہے اس کی بنا پر اب پیچیدہ ترین انسانی امراض کا علاج بھی دریافت ہو چکا ہے۔بڑے بڑے آپریشن اب روزمرہ کی بات ہو چکے ہیں۔اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ نہ صرف اوسط انسانی عمر میں بہت اضافہ ہو چکا ہے بلکہ انسانی آبادی سات ارب سے اوپر ہو چکی ہے۔

دور جدید کی سہولیات اور آسانیوں کی تفصیل اگر بیان کرنے بیٹھیں تو ہزاروں صفحات بھی اس کے لیے کم ہیں۔جس چیز کی طرف میں توجہ دلا رہا ہوں وہ یہ ہے کہ ان سہولیات کے نتیجے

میں حیات انسانی بے حد سہل، آرام دہ، محفوظ اور پرلطف ہو چکی ہے اور زمانہ قدیم میں جو کچھ بادشاہوں تک کو حاصل نہ ہوتا تھا وہ آج کے عام انسانوں تک کی دسترس میں آ چکا ہے۔

انسانیت، ہم اور خدا کا قانون

مگر اس غور فکر میں جو سب سے زیادہ تکلیف دہ چیز میرے سامنے آئی وہ یہ تھی کہ انسانیت کی اس ترقی میں آج کے مسلمانوں کا کوئی حصہ نہیں۔ آج کا مسلمان بے شعوری کے عالم میں ان میں سے ہر چیز سے بے تکلف استفادہ کر رہا ہے۔ مگر ان چیزوں کی تخلیق میں اور انسانیت کو آسانی، بھلائی اور منفعت دینے کے اس عمل میں آج کے مسلمانوں کا سرے سے کوئی کردار نہیں۔ ہمارے اردگرد ان گنت جدید چیزیں موجود ہیں۔ کار، بس، بجلی، کمپیوٹر، ائیر کنڈیشن، موبائل، ٹی وی، ٹیلیفون اور ان کے علاوہ ان گنت گھریلو اور دفتری آلات۔ ان میں سے ہر ایک پر نگاہ ڈالیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان میں سے کسی بھی ایجاد کا سہرا آج کے مسلمان کے سر نہیں۔ میرے لیے یہ احساس انتہائی تکلیف دہ تھا کہ ہم نے انسانیت کو کچھ نہیں دیا۔ انسانیت کی موجودہ ترقی، بھلائی اور منفعت میں ہمارا کوئی حصہ نہیں۔

اس موقع پر مجھے نفع بخشی کے حوالے سے پروردگار عالم کا وہ قانون یاد آ گیا جو قرآن کریم میں بیان ہوا ہے۔ سورۂ رعد میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

> اسی نے آسمان سے مینہ برسایا پھر اس سے اپنے اپنے اندازے کے مطابق نالے بہ نکلے، پھر نالے پر پھولا ہوا جھاگ آ گیا۔ اور جس چیز کو زیور یا کوئی اور سامان بنانے کے لیے آگ میں تپاتے ہیں اس میں بھی ایسا ہی جھاگ ہوتا ہے۔ اس طرح اللہ حق اور باطل کی مثال بیان فرماتا ہے۔ سو جھاگ تو سوکھ کر زائل ہو جاتا ہے اور (پانی) جو لوگوں کو فائدہ پہنچاتا ہے وہ زمین میں ٹھہرا رہتا ہے۔ اس طرح اللہ (صحیح اور غلط کی)

> مثالیں بیان فرماتا ہے (تاکہ تم سمجھو)۔ (رعد 17:13)

اس آیت کے مطابق جھاگ جو ایک غیر نفع بخش چیز ہے وہ زمین پر باقی نہیں رہتا جبکہ پانی جو انسان کی ایک بنیادی ضرورت ہے وہ زمین میں ٹھہرا رہتا ہے۔ ٹھیک یہی معاملہ انسانوں کا بھی ہے۔ جو شخص، گروہ یا قوم اپنے اعمال سے خود کو انسانیت کے لیے نفع بخش ثابت کرتی ہے وہی قوم زمین میں اپنی جگہ بنا پاتی ہے۔ جبکہ غیر نفع بخش افراد اور قوم جھاگ کی مانند بے کار ہوتے ہیں۔ اور بے کار چیزوں کا وہی انجام ہوتا ہے جو جھاگ کا ہوتا ہے۔

پدرم سلطان بود

بد قسمتی سے آج مسلمانوں کو ان کے رہنما یا تو نفرت کی خوراک دے رہے ہیں یا پھر فخر کی۔ وہ انہیں یہ بتاتے ہیں کہ ساری دنیا ان کی دشمن ہے اور ان کی ترقی میں اصل رکاوٹ دوسروں کی سازشیں ہیں۔ وہ انہیں یہ نہیں بتاتے کہ آج کے مسلمان نفع بخشی کی صلاحیت سے محروم ہو چکے ہیں۔ انہوں نے انسانیت کو کچھ نہیں دیا۔ جب کچھ دیا نہیں تو خدا کے قانون کے مطابق مسلمان آج کسی ترقی اور کامیابی کے حقدار بھی نہیں ہیں۔

مسلمان مفکرین نفرت کے زہریلے مواد پھیلانے کے علاوہ خوش گمانیوں کے محل تعمیر کرنے میں بھی اتنے ہی سرگرم ہیں۔ وہ مسلمانوں کو اسلاف کی عظمت کے قصے سناتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ان ماضی کے قصوں سے حال کی تعمیر ممکن ہے۔ ہمارے نصاب میں بچوں کو مسلمانوں کے سائنسی کارنامے پڑھا کر یہ سمجھا جاتا ہے کہ اسی عمل سے مسلمان سائنس میں آگے نکل جائیں گے۔ کسی شخص کا یہ دعویٰ کہ میرا باپ بادشاہ تھا (پدرم سلطان بود)، اس کے حال کو تبدیل نہیں کر سکتا۔ اپنا حال صحیح انداز فکر سے بدلتا ہے۔ یہ حقائق کا اعتراف کرنے سے بدلتا ہے۔ یہ اپنے عمل کی سمت صحیح رخ پر ڈالنے سے بدلتا ہے۔ یہ جذباتی نعروں اور نفرت کی باتوں کے بجائے

معقولیت اور امن و محبت کے راستے پر چلنے سے بدلتا ہے۔ پدرم سلطان بود سے اس دنیا میں کچھ نہیں ہوتا۔

دعوت کا راستہ

مسلمان آج جس حال میں ہیں اس کا سبب کسی اور کی خرابی نہیں مسلمانوں کی اپنی سوچ کی خرابی ہے۔ جو کچھ اچھائی اور بھلائی انہیں آج حاصل ہے وہ اللہ تعالیٰ کی عنایت اور مہربانی ہے۔ آج مسلمانوں کو حاصل تمام بھلائیاں اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہیں جن کا مقصد صرف یہ ہے کہ مسلمان انسانیت کو حق کا پیغام پہنچاسکیں۔ مسلمان حق کے امین ہیں۔ ان کے پاس دنیا کا سب سے بڑا خزانہ قرآن کریم کی شکل میں موجود ہے۔ اس عظیم نعمت اور اس کے پیغام کو اگر وہ انسانیت تک پہنچانے کا تہیہ کرلیں تو نہ صرف خدا کی نظر میں ان کی قدر و قیمت بڑھ جائے گی بلکہ انسانیت بھی انہیں سر آنکھوں پر بٹھائے گی۔

وقت آ گیا ہے کہ لوگ اس حقیقت کو سمجھیں۔ تعمیر اور تذکیر، امن اور انسانیت، ہدایت اور دعوت کی، ایمان اور اخلاق کی سوچ کو عام کیا جائے۔ ہدایت انسانیت کا حق ہے۔ خدا انسانیت کو اس کا یہ حق ضرور دے گا۔ وہ ہدایت کو اختیار کریں یا نہ کریں، یہ ان کا مسئلہ ہے۔ لیکن ہدایت کا ان تک پہنچنا مقدر ہے۔ اس کام میں کچھ وقت تو لگ سکتا ہے، مگر یہ کام رک نہیں سکتا۔ یہی وقت کا فیصلہ ہے۔

کامیاب زندگی کے کچھ نسخے

لوگ اور ان کی پریشانیاں

اپنی دعوتی زندگی میں مجھے ایک تجربہ اکثر لوگوں کے حوالے سے پیش آیا ہے۔ وہ یہ کہ لوگ اپنی ذاتی زندگی میں اکثر پریشانیوں اور مسائل کا شکار رہتے ہیں اور ان سے نمٹنے کا درست طریقہ نہیں جانتے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ مسلسل ذہنی اضطراب، ٹینشن، اسٹریس وغیرہ کا سامنا کرتے رہتے ہیں۔ یہ ذہنی اور نفسیاتی رویے برسہا برس میں جسمانی امراض میں بدل جاتے ہیں۔ جس سے جسمانی تکلیف کے ساتھ مالی مسائل کا بھی سامنا کرنا پڑ جاتا ہے۔ مزید یہ کہ ذہنی پریشانی کے ساتھ انسان کے مزاج میں چڑچڑاپن اور تلخی آجاتی ہے جس کے بعد باہمی تعلقات اور رشتوں میں بھی اکثر خرابی پیدا ہوجاتی ہے۔ یوں مسائل اور پریشانیوں کا سامنا جب درست طریقے سے نہیں کیا جاتا تو مزید مسائل پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں۔

یہ مسئلہ محض ہمارے اردگرد کے انسانوں کا نہیں بلکہ انڈسٹریل اور انفارمیشن ایج کے انسان کا ایک عالمی مسئلہ ہے۔ چنانچہ اس معاملے کی اہمیت اور وسعت کی بنا پر ان گنت لوگوں نے اس موضوع پر کام کیا ہے اور ان رویوں کی نشاندہی کی ہے جن کو اپنا کر جدید انسان مسائل کے گرداب سے نکل سکتا ہے۔ میں اس پورے کام کو دو حصوں میں دیکھتا ہوں۔ ایک کرائسز مینجمنٹ جس میں بحرانی صورتحال سے نکلنے یا کم از کم اس کا بہتر انداز میں مقابلہ کرنے کو زیر بحث لایا جاتا ہے۔ جبکہ

دوسرا سیلف مینجمنٹ ہے جس میں عام روزمرہ زندگی کو بہتر بنانے کے طریقے زیر بحث لائے جاتے ہیں۔ میں ان دونوں حوالوں سے ایک کورس مرتب کر کے اپنے قریبی رفقا کی تربیت کا ارادہ رکھتا ہوں۔لیکن قارئین کے لیے بھی اس حوالے سے کچھ نہ کچھ مفید چیزیں آج کی اس ملاقات میں زیر بحث لاؤں گا۔جن کے ذریعے سے وہ مذکورہ بالا مسائل سے بہتر انداز میں نبرد آزما ہو سکیں گے۔

ہمارے ہاں کے کچھ اضافی مسائل

ہمارے ہاں نہ صرف جدید صنعتی اور اب انفارمیشن دور سے وابستہ سارے مسائل موجود ہیں بلکہ بدقسمتی سے اس پر مزید کچھ ایسی چیزیں موجود ہیں جو صورتحال کو گھمبیر سے گھمبیر تر بناتی چلی جارہی ہیں۔مثلاً ہمارے ہاں غربت و جہالت بہت عام ہے۔ چنانچہ اس حوالے سے پیدا ہونے والے تمام مسائل پوری قوت سے یہاں موجود ہیں۔غربت لوگوں کے مسائل کو بڑھاتی چلی جارہی ہے اور جہالت انھیں ان مسائل کو حل کرنے نہیں دیتی۔مثلاً میں نے پیچھے مغرب کے حوالے سے یہ بیان کیا ہے کہ وہاں مسائل کے حل اور زندگی کو بہتر بنانے کے موضوع پر بے انتہا کام ہوا ہے۔مگر جہالت اور مطالعے کی عادت نہ ہونے کی بنا پر ہمارے لوگ اس بے مثال لٹریچر سے استفادہ کرنے سے محروم رہ جاتے ہیں۔

اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہمارے ہاں تعلیم و تربیت کے کم و بیش تمام ادارے تباہ ہو چکے ہیں یا پھر اپنا کام درست طور پر نہیں کر رہے۔مثلاً قدیم خاندانی اور کمیونٹی نظام میں بزرگ بچوں اور نوجوانوں کی رہنمائی کیا کرتے تھے۔مگر اب یہ نظام شکست و ریخت کا شکار ہو رہا ہے۔اساتذہ کا رول صرف تعلیم دینے تک محدود ہو گیا ہے۔علما کی دلچسپی سیاست اور فرقہ واریت وغیرہ سے ہے۔یہی حال دانشوروں کا ہے کہ سیاست کے سوا انھیں کوئی مسئلہ اہم نہیں لگتا۔فرد کی زندگی اور اس کے مسائل کی انھیں سمجھ ہے اور نہ یہ ان کی دلچسپی کا موضوع ہیں۔

میڈیا بدقسمتی سے ایسی چیزوں کو اپنا موضوع نہیں بناتا۔اپنی اصل کے اعتبار سے میڈیا تعلیم و تربیت کا ادارہ ہے بھی نہیں۔یہ انفارمیشن اور انٹرٹینمنٹ کا ادارہ ہے۔ہمارے ہاں البتہ یہ سانحہ مزید ہے کہ کئی اعتبار سے میڈیا مزید مسائل اور پریشانیاں پیدا کرنے کا سبب بن رہا ہے۔خاص طور پر نیوز میڈیا سنسنی، خوف اور ٹینشن پیدا کرنے کا بہت بڑا ذریعہ بن گیا ہے۔اسی طرح میڈیا پر سطحی اور بعض اوقات بیہودہ انٹرٹینمنٹ کی بھرمار لوگوں کے لیے اتنا وقت ہی نہیں چھوڑتی کہ وہ مطالعے کے لیے کچھ فرصت نکال سکیں۔

ایک وضاحت

میری تمہید کچھ لمبی ہو گئی مگر بہرحال یہ وہ صورتحال ہے جس میں ایک طرف مجھے اپنے اصل مقصد یعنی قرآن و سنت پر مبنی اصل دین کی دعوت اور توحید و آخرت کی منادی کا کام کرنا ہوتا ہے تو دوسری طرف انفرادی طور پر لوگوں کے مسائل کے حل کے لیے کوششیں کرنی پڑتی ہیں۔اس پس منظر میں میں آج کی ملاقات میں اسی حوالے سے کچھ چھوٹی چھوٹی چیزیں قارئین کے سامنے رکھوں گا جن سے ان کی زندگی میں بہت کچھ بہتری آسکتی ہے۔نیز پریشانیوں اور مسائل کے انبار میں دبے لوگ ان کو اپنا کر کافی حد تک راحت محسوس کریں گے۔ظاہر ہے کہ اس مختصر سی تحریر میں زیادہ تفصیل کا امکان نہیں۔اس لیے اختصار کے ساتھ کچھ اصولی باتیں پیش خدمت ہیں۔تاہم یہ خیال کرنا درست نہ ہوگا کہ میں کچھ چٹکلے بیان کر رہا ہوں۔زندگی کی گتھیاں دردِ سر کی طرح نہیں ہوتیں کہ اسپرین کی دو گولیاں کھا کر ختم ہو جائیں۔نہ یہ کپڑے پر لگا داغ کا دھبہ ہوتی ہیں کہ صابن سے نہ دھلا تو کسی خاص کیمیکل سے صاف کر لیا۔ان کے حل کے لیے انداز فکر کو بدلنا پڑتا ہے۔کچھ سنجیدہ فیصلے کرنے پڑتے ہیں۔معاملات کو کچھ مختلف انداز سے دیکھنا ہوتا ہے۔گرچہ کچھ ابتدائی اصولی نکات کے بعد میں بعض آسان اور عملی چیزیں بھی بیان کروں گا جو ٹوٹکوں کی طرح ہی زندگی کے بہت سے مسائل کو فوری طور پر حل

کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں،لیکن ابتدا کچھ اصولی مباحث سے ہوگی تاکہ شخصیت میں مستقل طور پر تبدیلی کی اساسات واضح ہوجائیں۔اب آیئے ان ابتدائی اصولوں کو دیکھتے ہیں۔

اپنی قوت کو استعمال کیجیے

اللہ تعالیٰ نے انسان کو غیر معمولی صلاحیتیں عطا کی ہیں۔ان صلاحیتوں میں سے بیشتر وہ ہیں جو انتہائی غیر معمولی ہونے کے باوجود ابتدا سے انتہا تک اپنا کام خود کرتی ہیں۔مثلاً انسان کے اندر ایک انتہائی غیر معمولی نظام یہ ہے کہ وہ خارج میں موجود نباتات اور حیوانات کو اپنی غذا بنا کر اسے توانائی میں تبدیل کر دیتا ہے۔یہ سسٹم اتنا غیر معمولی اور پیچیدہ ہے کہ اس کی تفصیلات پر ہزاروں کتابیں لکھی جاچکی ہیں اور اس سسٹم میں پیدا ہونے والی معمولی سی خرابی بھی انسانی زندگی کو ہلا کر رکھ دیتی ہے۔مگر اس سسٹم کی خصوصیت یہ ہے کہ بھوک لگانے والے کیمیکلز، غذا کو چبانے والے دانتوں، سنبھالنے والے ہونٹوں، لذت لینے والی زبان اور نگلنے والے گلے سے لے کر غذا کے جزوِ بدن بننے اور فضلات کے اخراج تک کا نظام تمام تر آٹومیٹک مشین کی طرح کام کرتا ہے۔انسان کا اس میں بس رسمی سا حصہ ہوتا ہے۔یہی جسم انسانی میں موجود دیگر ان گنت نظاموں کا معاملہ ہے۔

ان تمام جسمانی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے انسان کو انتہائی غیر معمولی نفسیاتی صلاحیت بھی عطا فرمائی ہے جو بڑے بڑے معجزات دکھا سکتی ہے۔مگر اس نفسیاتی صلاحیت کا معاملہ یہ ہے کہ یہ جسمانی صلاحیت کی طرح آٹومیٹک کام نہیں کرتی۔ بلکہ یہ انسان کے اپنے اوپر منحصر ہوتا ہے کہ وہ اس صلاحیت کو کتنا دریافت اور استعمال کرتا ہے۔یہی نفسیاتی صلاحیت انسان کا طرۂ امتیاز ہے۔ یہی اسے دیگر مخلوقات سے منفرد بناتی ہے، وگرنہ جسمانی نظام وغیرہ جیسی صلاحیتیں تو حیوانات کو بھی دی گئی ہیں۔مگر بدقسمتی سے لوگ اپنی اسی اصل قوت کو استعمال کرنا تو کجا دریافت بھی نہیں کر پاتے۔قسمت وحالات اور ماحول وتربیت انھیں جو بنا دیں وہ بن جاتے

ہیں۔خارج کی دنیا جس طرح چاہے انھیں ڈھال دیتی ہے۔وہ ہمیشہ اپنے مسائل کا رونا روتے رہتے ہیں اور کبھی اس اندرونی قوت کو دریافت نہیں کرتے جسے استعمال کر کے وہ نہ صرف اپنی زندگی بدل سکتے ہیں، بلکہ دیگر لوگوں کو بھی بے انتہا نفع پہنچا سکتے ہیں۔

انسان کی یہ نفسیاتی قوت کئی پہلو رکھتی ہے۔اس کی ذہانت، یادداشت، تخیل، تجزیہ وتحلیل کی صلاحیت وغیرہ اس کے اہم پہلو ہیں۔مگر اس کا سب سے اہم پہلو انسان کی قوتِ ارادی، عزم اور حوصلہ ہے۔یہی وہ چیز ہے جسے انسان ایک دفعہ دریافت کر لے تو پھر اس کے بعد وہ زندگی کے ہر مسئلے کو کسی نہ کسی طور حل کر لیتا ہے یا اس کی شدت کو کم کر سکتا ہے۔یہی نہیں بلکہ زندگی کی ہر نعمت اور بھلائی کو اپنی زندگی میں لا سکتا ہے۔

مگر اکثر لوگ اس قوت ارادی کو حالات کے رحم وکرم پر چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ مایوسی اور ڈپریشن کا شکار رہتے ہیں۔ان کے ساتھ جو بھی سانحہ پیش آجائے، جو بھی واقعہ رونما ہو جائے وہ اسے تقدیر کا لکھا سمجھ کر قبول کر لیتے ہیں۔زندگی کا سیل رواں انھیں جس سمت میں لے جائے وہ خاموشی سے ہاتھ پاؤں مارے بغیر اس کے ساتھ ساتھ بہے چلے جاتے ہیں۔ان کی زندگی ایک ایسا ڈرامہ ہوتی ہے جس میں ان کا کام خارج کے حالات اور دوسرے کے لکھے ہوئے اسکرپٹ پر اداکاری کرنا ہوتا ہے۔جبکہ میں جو بات سمجھانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ یہ حیثیت نباتات اور حیوانات کی ہوتی ہے۔انسان اپنی زندگی کی کہانی خود تخلیق اور تبدیل کر سکتا ہے۔وہ زندگی کے ڈرامے کا اداکار نہیں ہدایت کار ہے۔

چنانچہ اس پس منظر میں یہ سمجھ لیں کہ اگر آپ اپنی زندگی کو بہتر بنانا چاہتے ہیں تو سب سے پہلا کام یہ ہے کہ قوت ارادی اور عزم کو استعمال کرتے ہوئے اسے بہتر بنانے کا عزم کریں۔ یہ طے کریں کہ آپ کی زندگی کا فیصلہ خارج کے حالات نہیں کریں گے بلکہ آپ کی زندگی کا فیصلہ آپ خود کریں

گے۔آپ اپنے حالات ومعاملات کو بہتر بنانے کی کوشش کریں گے۔اس راہ میں یقیناً مشکلات پیش آئیں گی۔بار بار ناکامی ہوگی۔مگر آپ مسائل کی دیوار پر اپنے آہنی عزم کے ہتھوڑے برساتے رہیں گے۔یہاں تک کہ وہ دیوار مکمل طور پر ڈھہ جائے۔

مختصر یہ کہ قوت ارادی،عزم اور پچھلی ناکامی کو بھول کر بار بار کوشش کرنے کا فیصلہ وہ بنیادی کلید ہے جو آپ کے ہر مسئلے کو آخر کار حل کردے گی۔اس یقین کے ساتھ اٹھیے کہ آپ مجبور نہیں بلکہ وہ خودمختار انسان ہیں جس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی روح پھونکی ہے۔اس روح کی وجہ سے آپ میں وہ خدائی فیضان موجود ہے جو ہر ناممکن کو ممکن بنا سکتا ہے۔

what is your mission?

خود کو بدلنے کے عزم کے بعد کامیابی اور خوشی کا راستہ ایک اور موڑ سے گزرتا ہے۔یہ موڑ اگر آپ نے نہیں مڑا تو پھر زندگی بھر کبھی آپ سچی خوشی نہیں دیکھ سکیں گے۔یہ موڑ اپنے آپ سے یہ سوال کرنا ہے کہ زندگی میں تمھارا مقصد ہے کیا؟ قوت ارادی کو بھول کر جینے کی طرح لوگ اس بات سے بھی واقف نہیں کہ زندگی کا مقصد اور مشن کیا ہوتا ہے اور کس طرح یہ آپ کی خوشیوں اور کامیابی کا ضامن ہے۔بلکہ سچی بات یہ ہے کہ اگر آپ نے اس بارے میں کبھی نہیں سوچا تو پھر درحقیقت آپ اس چیز سے واقف ہی نہیں کہ سچی خوشی اور حقیقی کامیابی کیا ہوتی ہے۔

نئے فیشن کے کپڑے خرید لینا،اپنی پسند کا کھانا کھالینا،اپنے ذوق کا مکان بنالینا وغیرہ بظاہر کامیابی اور خوشی کی چیزیں محسوس ہوتی ہیں۔مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ بہت سطحی چیزیں ہیں۔ان کا سچی خوشی اور حقیقی کامیابی سے کوئی تعلق نہیں۔ان کا المیہ یہ ہے کہ جیسے ہی آپ انھیں حاصل کرتے ہیں،یہ آپ کی نگاہوں میں بے وقعت ہوجاتی ہیں۔اب آپ مجبور ہوجاتے ہیں کہ ان کی کشش زائل ہونے کے بعد ایسی کسی اگلی نئی،مگر ویسی ہی سطحی چیز کے پیچھے بھاگنا شروع کردیں۔یہ سراب کے پیچھے

بھاگنے جیسا ہے۔ساری زندگی آپ بھاگتے رہیں گے۔مگر سچی خوشی اور اطمینان آپ کو کبھی نہیں ملے گا۔بلکہ ان چیزوں کے لیے کی جانے والی جدوجہد اور پیش آنے والی پریشانیاں وغیرہ آپ کے ہر رنگ میں بھنگ گھولتی رہیں گی۔

اس کے برعکس جیسے ہی آپ زندگی کی مقصدیت اور مشن کو متعین کریں گے تو آپ کی زندگی بالکل صحیح ڈگر پر آجائے گی۔آپ اپنی خوشی اور اطمینان کا ایک اایسا پیمانہ بنالیں گے جسے نہ صرف حاصل کرنا آپ کے لیے ممکن ہے بلکہ جو کچھ آپ حاصل کریں گے اس سے آپ کبھی بور نہیں ہوں گے۔بلکہ یہ آپ کی زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ بن جائے گا۔حالات کی سختیاں،زندگی کے موسموں کی تپش،گردش زمانہ کی ہر پریشانی اور محرومی آپ پر غیر مؤثر ہوجائے گی۔

یہ مقصد اور مشن ہر فرد،اس کے حالات،اس کے ذوق وغیرہ کے اعتبار سے مختلف ہوسکتا ہے۔ایک عام گھریلو خاتون سے لے کر ایک حوصلہ مند نوجوان اور ایک بزرگ سے لے کر ایک ادارے کے سربراہ کے لیے یہ مشن ایک ایسی شکل میں سامنے آسکتا ہے جو اس کے اپنے حالات کے اعتبار سے خاص ہو۔مثلاً ایک گھریلو خاتون کے لیے یہ مشن اپنے خاندان کی بہترین تربیت، گھر میں خوشگوار ماحول کی فراہمی اور بچوں کو تعلیم یافتہ اور مہذب بنانا ہوسکتا ہے۔جبکہ ایک کاروباری شخص کے لیے یہ مشن اپنے علاوہ دوسرے لوگوں کے لیے بھی حلال روزگار کی فراہمی اور ساتھ میں نصرت دین کے لیے مال کی فراہمی ہوسکتا ہے۔مشن خواہ کچھ بھی ہو،اہم بات یہ ہے کہ مشن کی اساس اخلاقی ہونی چاہیے۔مندرجہ بالا مثالوں سے یہ ظاہر ہے کہ مشن میں مادی عناصر ہوسکتے ہیں یعنی مال کا حصول یا اولاد کی اعلیٰ تعلیم لیکن ضروری ہے کہ اس کی اساس میں اعلیٰ اخلاقی اصول شامل ہوں۔تنہا مادی مشن انسان کو سچی خوشی نہیں دے سکتا۔مثلاً ایک شخص کا مشن اگر یہ ہے کہ وہ اپنے لیے عالیشان گھر بنائے تو عین کامیابی کے کنارے پہنچ کر اسے معلوم ہوگا کہ

جلد یا بدیر یہ کامیابی اس سے چھننے والی ہے، یہ کامیابی اس کے لیے اپنی کشش کھو چکی ہے یا پھر اس کامیابی کے پیچھے وہ ظلم اور حرام کا راستہ اختیار کر چکا ہے۔ صورت کچھ بھی ہو انسان سچی خوشی اور سکون سے محروم ہو جائے گا۔ جبکہ اخلاقی اساسات پر مبنی مشن میں انسان ہمیشہ ذہنی سکون حاصل کرتا ہے۔ اگر مشن کے مادی پہلو میں اسے ناکامی بھی ہو جائے تب بھی یہ احساس بڑی نعمت ہوتا ہے کہ اس کے نصب العین کا اخلاقی پہلو بہر حال کامیابی سے ہمکنار ہوا ہے۔

مشن کے دو پہلو

مشن کے اعتبار سے ایک اور چیز بڑی اہم ہے۔ وہ یہ کہ اس کے دو پہلو ہونے چاہییں۔ ایک یہ کہ آپ کو زندگی میں کیا بننا ہے۔ دوسرے یہ کہ آپ کو زندگی میں کیا کرنا ہے۔ کیا کرنا ہے اس کی کچھ مثالیں تو اوپر بیان ہو چکی ہیں، اب کیا بننا ہے کا مطلب سمجھ لیں۔ کیا بننے کا مطلب وہ نہیں ہے جو بچے اس سوال کے جواب میں کہتے ہیں کہ انھیں زندگی میں پائلٹ یا ڈاکٹر بننا ہے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ اپنی شخصیت کے بارے میں یہ طے کرتے ہیں کہ اسے کس رخ پر ڈھالنا ہے۔ کون سی اعلیٰ انسانی اور اخلاقی صفات، تہذیبی اور دینی رویے خود میں پیدا کرنے ہیں۔ مشن کا یہ وہ حصہ ہے جو خارج میں کیا کرنے والے حصے سے کہیں زیادہ مشکل ہے، لیکن اس کے نتیجے میں انسان حقیقی مسرت اور شادمانی سے روشناس ہوتا ہے۔ کیونکہ پھر وہ ایسا بن جاتا ہے جیسا کہ اس نے چاہا نہ کہ جیسا اس کے حالات اور ماحول نے اسے بنا دیا۔

اس کو مزید کچھ مثالوں سے سمجھیں۔ فرض کیجیے کہ آپ میری یہ تحریر پڑھنے کے بعد قوت ارادی کو استعمال کر کے زندگی بدلنے کا عزم کرتے ہیں۔ زندگی کا مشن متعین کرتے وقت آپ کو یہ احساس ہوتا ہے کہ آپ کی شخصیت میں ماضی کے حالات اور تربیت کی بنا پر بعض انتہائی ناگوار صفات در آئی ہیں۔ جیسے بے وجہ، بے انتہا اور بار بار غصہ ہونا۔ یا آپ یہ محسوس کرتے ہیں کہ آپ

بلاوجہ بہت زیادہ بولتے ہیں اور اس کی بنا پر آپ کو بارہا مسائل کا سامنا کرنا پڑ جاتا ہے۔ اب آپ طے کرتے ہیں کہ آپ کو اس عادت کو اپنی شخصیت سے کھرچ کر پھینک دینا ہے۔ اس کے لیے آپ کو ہر وہ ممکن طریقہ اختیار کرنا ہوگا جس سے یہ عادت خود سے دور ہو جائے۔ اپنی غلطیوں اور دوسرے لوگوں کے تجربے سے سیکھنا ہوگا، مطالعے، صالحین اور حکما کی مدد سے اصلاح کا راستہ ڈھونڈنا ہوگا۔ اس عمل میں بار بار غلطی کے باوجود آپ بہتر ہوتے چلے جائیں گے۔ ہر کامیابی اپنی نگاہوں میں آپ کا وقار اور دوسروں کی نظروں میں آپ کی وقعت بڑھا دے گی۔ مادی نفع و نقصان کے بجائے آپ کی ساری توجہ اس مقصد میں کامیابی و ناکامی کے گرد مرتکز ہو جائے گی۔ نتیجہ یہ نکلے گا کہ خوشی و اطمینان بتدریج آپ کا احاطہ کر لیں گے۔

اسی طرح آپ یہ دیکھتے ہیں کہ بعض دوسرے لوگوں میں بعض اعلیٰ خصلتیں موجود ہیں جو آپ میں نہیں ہیں۔ جس کے بعد آپ میں یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ آپ خود میں ان چیزوں کو پیدا کریں۔ چنانچہ اس کے لیے آپ جدوجہد شروع کر دیتے ہیں۔ زیادہ وقت نہیں گزرے گا کہ آپ کے اندر آہستہ آہستہ یہ خوبیاں پیدا ہونے لگیں گی۔ لیکن یہ ذہن میں رہے کہ ہمیشہ خود کو بہتر بنانے کی اسپرٹ زندہ رہنی چاہیے۔ کبھی ناکامی سے دلبرداشتہ نہیں ہونا چاہیے۔

مختصر یہ کہ خود کو بہتر بنانے کو اپنی زندگی کا مشن بنائیے۔ یہ مشن آپ کو خوشی اور سکون کا ایسا سرمایہ دے گا جو کوئی اور چیز کبھی نہیں دے سکتی۔ اسی طرح یہ زندگی ااور اس کے مسائل کے بارے میں بھی آپ کا نقطۂ نظر بدل دے گا۔ تاہم مسائل چونکہ زندگی کا حصہ ہیں۔ اس لیے ان سے نمٹنے کے کچھ طریقے بھی مجھے زیرِ بحث لانے ہیں۔ اسی طرح مشن کے تعین کے بعد زندگی کو اس کے مطابق ڈھالنا بھی ایک کام ہے۔ ان دونوں امور پر انشاءاللہ اگلے ایک دو ماہ میں کسی وقت گفتگو ہوگی۔

فکرو پریشانی اور غم سے نجات

فکرو پریشانی ہر شخص کا مسئلہ

اللہ تعالیٰ نے یہ کائنات آزمائش کے اصول پر بنائی ہے۔اس آزمائش کا ایک بڑا حصہ ان مسائل و مصائب پر مشتمل ہے جو ہر انسان کو پیش آتی ہیں۔اس لیے انسان کسی بھی رنگ، نسل، زمانے اور قوم کا ہو، فکرو پریشانی سے کسی نہ کسی طور اس کا سابقہ پیش آتا ہے۔ان حالات میں صبر کرنا دین کا ایک مطلوب رویہ ہے۔لیکن یہ صبر کیسے آئے گا، اس کا ایک طریقہ وہ ہے جو روایتی انداز میں بیان کیا جاتا ہے یعنی صبر کے فضائل اور اس کا اجر بیان کیا جائے۔یہ بھی بلاشبہ ایک بڑا موثر طریقہ ہے۔لیکن دور جدید کی تیز رفتار اور مادیت سے بھرپور زندگی کے نتیجے میں اور خاص کر پاکستان میں رہنے والے لوگوں کو مستقل گوناگوں مسائل اور مصائب سے اس طرح سابقہ پیش آتا رہتا ہے کہ پریشان رہنا لوگوں کی عادت بن گئی ہے۔اس لیے میں اس موضوع پر اپنے قریبی رفقا کو کرائسز مینجمنٹ یا اسٹریس مینجمنٹ کے نام سے ایک کورس کرا رہا ہوں۔اس کے بعد ایک اور کورس سیلف مینجمنٹ کے نام سے اس کے بعد انشاء اللہ کرانے کا ارادہ ہے۔ارادہ ہے کہ اس کے بعض اہم نکات تحریری شکل میں افادہ عام کے لیے شائع بھی کر دیے جائیں۔

ان چیزوں کو سمجھنے کا فائدہ

اس طرح کی چیزوں کا سیکھنا دو پہلوؤں سے اہم ہوتا ہے۔ایک یہ کہ ہمارا دین ہمارے

سامنے جو اخلاقی مطالبات رکھتا ہے ان کی نوعیت یہ ہوتی ہے ہمیں زندگی میں کچھ چیزوں کو کرنا اور کچھ سے رکنا ہوتا ہے۔مگر انسان کا معاملہ یہ ہے کہ اخلاقی عمل اس کے ذہن سے نہیں پھوٹتا بلکہ اس کی شخصیت سے پھوٹتا ہے۔مطلب اس بات کا یہ ہے کہ مادی معاملات میں تو ذہن انسانی جیسے ہی ایک فیصلہ کرتا ہے اس کا اعصابی نظام فوراً اعضا تک حکم پہنچانتے ہیں اور فیصلہ پر عمل درآمد ہو جاتا ہے۔ جیسے پیاس لگی تو پافوراًنی پی لیا، بھوک لگی تو کھانا کھالیا۔تفریح کا دل چاہا تو کہیں گھومنے چلے گئے۔جبکہ اخلاقی معاملات میں انسان کے کام کرنے کا طریقہ یہ نہیں کہ ذہن نے ایک چیز کو مان لیا اور پھر انسان فوراً اس پر عمل شروع کر دے۔بلکہ ہوتا یہ ہے کہ بچپن ہی سے انسان کے حالات اور ماحول اس کی ایک خاص شخصیت، انداز فکر، عادات اور رویے تشکیل دے چکے ہوتے ہیں۔ذہن کا ہر حکم ان شخصی رویوں کی چھلنی سے ہو کر گزرتا ہے۔جو اخلاقی معاملہ شخصی رویوں کے مطابق ہوا تو انسان وہ کام کر لیتا ہے، وگرنہ ذہن دو چار زبردستی عمل کروا بھی لے، لیکن کچھ ہی عرصے میں انسان اپنے ذہن کے بجائے شخصیت سے احکام وصول کرنے لگتا ہے۔

اس کو ایک مثال سے سمجھیں کہ ایک شخص فجر کی نماز کی اہمیت اور فضیلت جان کر صبح اٹھنے کا مصمم ارادہ کرتا ہے۔لیکن اگر شخصی رویہ اور عادت دیر تک جاگنے اور دیر تک سونے کی ہے تو انسان ایک دو دفعہ یہ کام کر لے گا، مگر پھر اس پر استقامت نہیں رکھ سکے گا۔یہی معاملہ پریشانیوں میں صبر و رضا کا ہے۔انسان کا مزاج اور شخصیت کی تعمیر اگر عجلت پسندی، بے صبری، بے چینی کی اینٹوں سے ہوئی ہے تو انسان ہر ایسے موقع پر جزا فزا کرے گا۔سو خلاصہ یہ ہے کہ دین کے احکام پر عمل کرنے کے لیے شخصیت کی اصلاح بہت ضروری ہے۔

ان چیزوں کو سیکھنے کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ ضروری نہیں زیر بحث آنے والی ہر چیز یا ہر شخصی کمزوری اور مسئلہ خود ہم میں ذاتی طور پر ہو۔بلکہ عین ممکن ہے کہ ہم میں نہ ہو بلکہ ہمارے کسی قریبی

شخص میں ہو۔لہٰذا ہم اگر اس چیز کو سمجھتے ہوں گے تو اس کی بہتر مدد کر سکیں گے۔ دوسرے یہ کہ عین ممکن ہے کہ سر دست ہم ایسے کسی مسئلے میں نہ گھرے ہوں، مگر زندگی جلد یا بدیر ہمیں کسی ایسے مقام پر لے آئے جہاں ایسی ہی کسی نوعیت کی آزمائش اور مشکل ہماری منتظر ہو۔ ایسے میں اگر ہم نے ان چیزوں کو پہلے ہی سمجھ رکھا ہے تو ہم بہتر انداز میں ان کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو سکیں گے۔

پریشانی اور مفید پریشانی

پریشانی کیا ہوتی ہے، محسوسات کے درجے میں تو سب لوگ اس بات سے واقف ہوتے ہیں۔مگر ضروری ہے کہ علمی انداز میں اس کو سمجھا اور بیان کیا جائے۔ پریشانی ذہن کی وہ حالت ہے جس میں طبیعت میں بے چینی اور اضطراب پیدا ہوجاتا ہے۔ یہ اضطراب کسی موجودہ یا متوقع مسئلے کی بنا پر پیدا ہوتا ہے۔ ذہن اندیشوں اور منفی خیالات کی آماجگاہ بن جاتا ہے۔ یہ لمحاتی کیفیت نہیں ہوتی بلکہ بار بار ذہن پر حملہ کرتی ہے اور انسان کی قوت عمل کو مفلوج کرتی چلی جاتی ہے۔ یہی اس کا سب سے بڑا نقصان ہے کہ یہ انسان کے حال اور لمحہ موجود میں اس کی فکر و عمل کو معطل اور مفلوج کر دیتی ہے۔

یہیں سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ ہر پریشانی بری نہیں ہوتی۔ کیونکہ پریشانی ان بنیادی عوامل میں سے ایک ہے جو انسان کو عمل پر ابھارتی ہیں۔لیکن یہ پریشانی وہ ہوتی ہے جو ذہن پر سوار نہیں ہوتی بلکہ ایک مسئلہ سامنے آتا ہے، دماغ پر اس کا ایک اثر ہوتا ہے۔ تاہم دماغ کی یا درست الفاظ میں شخصیت کی اگر اچھی تربیت ہو تو انسان مناسب اقدامات اٹھا کر مسئلے کو حل کر دیتا ہے۔ گویا پریشانی اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والا اسٹریس نہ ہو تو کوئی مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ اس بات کو ایک مثال سے سمجھیں۔

فرض کریں کہ آپ کے گھر میں کسی کو کوئی گہرا زخم آگیا اور بہت خون بہنے لگا۔ اس پر پریشان ہونا ایک فطری امر ہے۔ یہ پریشانی اسٹریس پیدا کرے گی۔ جس کے بعد آپ مسئلہ حل کرنے کی

کوشش کریں گے۔ پہلے آپ خون روکنے کی کوشش کریں گے اور پھر کسی ڈاکٹر سے رجوع کریں گے۔ اگر آپ پریشان نہ ہوتے تو مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ اس اعتبار سے پریشانی ایک مثبت جذبہ ہے لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ عمل پر پریشانی نہیں بلکہ اسٹریس یا ذہنی دباؤ ابھارتا ہے جو پریشانی سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ دباؤ نہ ہو تو انسان کام نہیں کرتے۔ یہی مسائل کے حل کا درست طریقہ ہے۔ یعنی مسئلہ...... پریشانی......اسٹریس......تحلیل و تجزیہ......اور پھر عمل۔ مگر بیشتر لوگ اس پروسیس سے اس طرح گزرتے ہیں۔ مسئلہ...... پریشانی...... اسٹریس...... اور پریشانی ...... مزید اسٹریس...... اور پھر عمل۔ ایسا عمل جو تحلیل و تجزیہ کے بغیر ہو بار ہا مسئلے کا حل نہیں ہوتا اور ہو بھی تو اس سے قبل انسان پریشانی کے ہاتھوں بہت نقصان اٹھا چکا ہوتا ہے۔

پریشانی اور غم کا فرق

یہاں یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ جس طرح پریشانی انسان کا سکون غارت کرتی ہے اسی طرح غم بھی یہی کام کرتا ہے۔ مگر دونوں میں ایک فرق ہے جسے سمجھ لینا چاہیے۔ پریشانی کا تعلق حال یا مستقبل کے کسی مسئلے یا خطرے سے ہوتا ہے۔ اس اردو مترادفات ان تمام کیفیات کا بیان کرتے ہیں جن سے ہم گزرتے ہیں یعنی بے چینی، اضطراب، تردد، فکر، تشویش، اندیشہ، خوف وغیرہ۔ جبکہ غم کا تعلق ماضی کے کسی نقصان سے ہوتا ہے۔ جس کے بعد انسان پر طاری ہونے والی کیفیات کے لیے ہم صدمہ، الم، پچھتاوا، کوفت، دکھ، افسوس، صدمہ وغیرہ کے الفاظ بولتے ہیں۔ ان دونوں میں اس فرق کے باوجود یہ دونوں یکساں طور پر انسان کے لیے تباہ کن ہیں اور آگے کی گفتگو پریشانی کے ساتھ غم کو بھی پس منظر میں رکھتے ہوئے کی جائے گی۔

غم ہو یا پریشانی یہ دونوں ذہنی کیفیت ہیں۔ اس کے علاوہ ایک اور چیز بھی ہوتی ہے جو ہمارا سکون غارت کر دیتی ہے وہ ہے جسم کو پہنچنے والی تکلیف۔ جس کے لیے ہم بیماری، درد، اذیت، تکلیف، مصیبت وغیرہ کے الفاظ بولتے ہیں۔ اس سے بھی پریشانی پیدا ہوتی ہے، لیکن یہ ہمارا

موضوع نہیں۔ کیونکہ لوگ جبلی طور پر اس کا ازالہ کرنے یعنی علاج کرنے کے لیے فوراً آمادہ ہو جاتے ہیں۔ جبکہ پریشانی اور غم کو لوگ اپنی زندگی بنا لیتے ہیں جو ایک تباہ کن رویہ ہے۔

اب مختصراً میں پریشانیوں کے حوالے سے تین بنیادی باتیں آپ کے سامنے رکھوں گا جن کا جاننا ہر شخص کے لیے ضروری ہے۔

پریشانیوں سے متعلق پہلی بات

پہلی بات یہ ہے کہ پریشانی گرچہ ایک ذہنی رویہ ہے، مگر انسانی جسم کو بیمار کرنے، انسانی سکون کو ختم کرنے اور رشتوں اور ذمہ داریوں کی نبھانے کی صلاحیت کو برباد کرنے کی زبردست صلاحیت رکھتا ہے۔ پریشانی اگر مستقل رہے یا انسان پریشان ہونے کی عادت ڈال دے تو آہستہ آہستہ جسم مختلف عوارض کا شکار ہو جاتا ہے۔ دل اور پیٹ کی اکثر بیماریوں سے لے کر دانتوں کی کمزوری اور جنسی کمزوری تک اسی پریشانی سے پیدا ہوتی ہیں۔ اس کا سبب بالکل واضح ہے۔ ہر پریشانی اسٹریس پیدا کرتی ہے۔ اس اسٹریس کے نتیجے میں عضلات تن جاتے ہیں اور جسم مختلف کیمیکلز خارج کرنا شروع کر دیتا ہے۔ یہ گویا ایک زبردست انرجی ہوتی ہے جو عمل کرنے کی انسانی صلاحیت کو بہت زیادہ بڑھا دیتی ہے۔ مگر جب انسان عمل نہ کرے اور صرف پریشان ہوتا رہے تو یہ انرجی ایک زہر بن کر وجود میں پھیل جاتی ہے۔ رفتہ رفتہ یہ زہر وجود انسان کو چاٹ جاتا ہے۔

اسی طرح پریشانی نہ صرف طبیعت کے سکون اور نشاط کو غارت کرتی ہے بلکہ انسان کی ذہنی استعداد اور عملی کارکردگی کو بھی تباہ کر کے رکھ دیتی ہے۔ مزید یہ کہ مزاج میں پیدا ہونے والا چڑچڑا پن اور جھنجھلاہٹ رشتوں اور تعلقات میں بھی زہر گھول دیتے ہیں۔ اس لیے پریشان سے نجات حاصل کرنا ایک پرسکون اور صحت مند زندگی کا لازمی تقاضہ ہے۔

پریشانیوں سے متعلق دوسری بات

غم و پریشانی سے متعلق دوسری بات یہ ہے کہ یہ انسان کے قوت عمل کو مفلوج کر دیتی ہے۔

جبکہ انسان کا اصل سرمایہ اس کا آج اور لمحہ موجود ہے۔ ماضی معدوم و ناپید ہو چکا ہے اور مستقبل نامعلوم ہے۔ انسان کے پاس جو کچھ بھی ہے وہ آج اور ابھی کا وقت ہے۔ اگر اس کو بھی غم و فکر کی نظر کر دیا تو گویا زندگی ضائع کر دی۔ یہ اتنا بڑا نقصان ہے کہ جس کا ازالہ ممکن نہیں۔

اس لیے غم و پریشانی کے ہر موقع پر لازمی ہے کہ انسان سوگ اور تردد کی کیفیت کو کونے میں رکھے اور سراپا عمل بن جائے۔ اس کا یہ عمل نہ صرف اس کے وقت کو مفید بنا دے گا بلکہ اس کو وہ ذہنی سکون بھی مل جائے گا جس سے وہ محروم ہو گیا تھا۔ کیونکہ انسان جس وقت کوئی کام کر رہا ہوتا ہے تو اس کی ساری توجہ اسی کی طرف ہوتی ہے۔ جس کی بنا پر انسان کو فکر و غم کے لیے موقع ہی نہیں ملتا۔ اس کے علاوہ انسان اگر مستقبل میں بھی پریشانی سے بچنا چاہتا ہے تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ آج کو استعمال کریں اور آئندہ کی پلاننگ اور تیاری کریں۔ یہ زندگی کے مسائل سے نمٹنے کا بہترین طریقہ ہے۔

اس کی ایک مثال یہ ہے کہ جو طالب علم روزانہ کی بنیاد پر محنت کرتے ہیں، امتحان نزدیک آنے پر وہ پرسکون رہتے ہیں۔ لیکن اپنے ملے ہوئے آج کے وقت کو ضائع کرنے والے طلبا امتحان قریب آنے پر زبردست پریشانی اور دباؤ کا شکار ہو جاتے ہیں۔ آج اور ابھی زندگی کا اصل سرمایہ ہے۔ عمل کیجیے اور اس سرمائے کو امر کر دیجیے۔ ورنہ دوسری صورت میں یہ خود ہی ضائع ہو جائے گا۔

پریشانیوں سے متعلق تیسری بات

پریشانیوں سے متعلق تیسری بات یہ ہے کہ جس وقت پریشانی آ جائے تو اسے خود پر حاوی مت ہونے دیں۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ تین مراحل میں تحلیل و تجزیے کے ایک ذہنی عمل سے گزریں۔ سب سے پہلے یہ دیکھیں کہ اس مسئلے سے زیادہ سے زیادہ نقصان کیا ہوگا۔ مثال کے طور پر دفتر میں باس نے آپ کو کوئی کام دیا۔ مگر مقررہ ڈیڈ لائن تک آپ وہ کام نہیں کر سکے۔ یہ ایک مسئلہ ہے۔ ذہنی عمل کا پہلا مرحلہ یہ بتاتا ہے کہ اس کا زیادہ سے زیادہ نقصان یہ ہوگا کہ آپ کی جاب چلی جائے گی اور آپ معاشی پریشانی میں گھر جائیں گے۔

ذہنی عمل کے دوسرے مرحلے میں خود کو تیار کریں کہ اگر یہ بدترین صورتحال پیدا ہو بھی گئی تو اسے قبول کرلوں گا۔ اس عمل کا فائدہ یہ ہے کہ ذہن پریشانی کی بنا پر اعصاب کو متحرک کرنے کے لیے مسلسل کیمیکل خارج کر رہا ہوتا ہے جس سے زبردست تناؤ اور دباؤ پیدا ہو رہا ہوتا ہے۔ مگر جس وقت آپ بدترین کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہوجاتے ہیں، ذہن پرسکون ہوجاتا ہے۔ نتیجتاً تناؤ اور دباؤ کی کیفیت ختم ہوجاتی ہے۔ ذہن کا فوکس مسئلے کی طرف سے ہٹ جاتا ہے۔

یہیں سے اب تیسرا مرحلہ شروع ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ پوری یکسوئی کے ساتھ مسئلے کا حل سوچنا شروع کردیں۔ زیادہ وقت نہیں گزرے گا کہ آپ کو مسائل کا حل سمجھ میں آجائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو یہ صلاحیت دی ہے کہ وہ بیشتر مسائل کا حل نکال سکتا ہے۔ چنانچہ جیسے ہی آپ یکسوئی سے سوچیں گے جلد یا بدیر مسئلے کا ایک قابل عمل حال سامنے آجائے گا۔ جیسے اس مثال میں ممکن ہے کہ آپ پر واضح ہوجائے کہ وقت پر اسائمنٹ پورا نہ ہونے کا سبب آپ کی کوتاہی نہیں بلکہ بعض دوسروں لوگوں کی غلطی ہے۔ جس کے بعد آپ بہتر انداز میں گفتگو کرکے اپنا مقدمہ پیش کرسکتے ہیں۔ بہتر اور مدلل گفتگو بڑے بڑے مسائل حل کردیتی ہے، مگر یہ کام ایک ٹھنڈا اور پرسکون ذہن کرسکتا ہے۔ پریشان اور ٹینشن میں مبتلا ذہن یہ کام نہیں کرسکتا۔

یہ کچھ ابتدائی گزارشات ہیں جو مسائل کے حل میں ہم سب کی رہنما ہوسکتی ہیں۔ شرط یہ ہے کہ ہم انہیں سنجیدگی سے لیں اور ان پر عمل کرنے کی کوشش کریں۔ میں انشاء اللہ کوشش کروں گا کہ اس حوالے سے آئندہ بھی کچھ نہ کچھ لکھتا رہوں۔

مسائل سے نمٹنے کا عملی طریقہ

مسائل کے حل کا سہ نکاتی فارمولا

میں انسانی زندگی میں درآنے والی پریشانیوں اور ان کے حل کے حوالے سے بعض اہل علم کے کام کو بنیاد بنا کر اپنے قریبی رفقا میں کچھ لیکچرز دے رہا ہوں، اس لیے یہ چیزیں ذہن میں تازہ ہیں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ آج کی اس ملاقات میں ان میں سے بعض چیزیں قارئین کے سامنے مزید پیش کی جائیں۔ مگر اس سے قبل پچھلے کالم کا خلاصہ کرلیں۔

پچھلے کالم میں جو بات بیان کی گئی تھی اس کا خلاصہ یہ تھا کہ مسائل دو پہلو سے ہمیں متاثر کرتے ہیں۔ یہ کہ ہمیں زبردست ذہنی خلفشار اور پریشانی میں مبتلا کردیتے ہیں۔ اس خلفشار کے عالم میں بارہا انسان کوئی عملی قدم نہیں اٹھا پاتا اور اٹھاتا ہے تو دباؤ کے تحت غلط قدم اٹھاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ ذہنی خلفشار اور پریشانی اگر مسلسل قائم رہے تو ان گنت تکلیف دہ اور جان لیوا بیماریوں کا سبب بن جاتی ہے۔ اس لیے اس صورتحال سے جلد از جلد نکلنا ضروری ہوتا ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ مسئلے کے بدترین نتائج کو متعین کیجیے۔ ذہنی طور پر خود کو تیار کیجیے کہ آپ بدترین کا سامنا بھی کرلیں گے۔ اس کے بعد اس حل کی تلاش شروع کردیجیے جو ان حالات میں بہترین ممکنہ حل ہوسکتا ہے۔

اس طریقہ کار کا فائدہ یہ ہے کہ انسان جب بدترین کو ذہنی طور پر قبول کرنے کے لیے تیار

ہوجاتا ہے تو وہ ٹینشن اور پریشانی سے نکل جاتا ہے۔ جس کے بعد انسان کا ذہن پوری طرح مسئلے کے حل پر فوکس ہوجاتا ہے اور ذہن انسانی اکثر حالات میں مسائل کا ایسا حل ڈھونڈ لیتا ہے جس سے بیشتر پریشانیاں ختم ہوجاتی ہیں۔

اس کالم پر بعض قارئین کا یہ فیڈ بیک آیا کہ جو کچھ میں نے لکھا وہ اپنی ذات میں مفید اور موثر ہے، لیکن عملی چیزیں بھی بیان کرکے مسائل سے نمٹنے کا طریقہ سکھایا جائے۔ آج کی اس ملاقات میں انشاءاللہ میں مسائل کے حل کا ایک عملی طریقہ آپ کے سامنے رکھنے کی کوشش کروں گا۔ پچھلے کالم میں جو آخری بات بیان کی گئی تھی کہ اس حل کی تلاش شروع کردیجیے جو ان حالات میں بہترین ممکنہ حل ہوسکتا ہے، اس کا عملی طریقہ میں آج ایک سہ نکاتی فارمولے کی شکل میں آپ کے سامنے رکھوں گا۔

پہلا نکتہ: حل سے پہلے مسئلے کی تشخیص

اس ضمن میں پہلا نکتہ یہ ہے کہ مسئلہ پیش آنے پر ہم میں سے اکثر لوگ ایک بنیادی غلطی کرتے ہیں۔ وہ یہ کہ مسئلے کو پوری طرح سمجھے بغیر حل تلاش کرنے یا تجویز کرنے کی طرف چھلانگ لگادیتے ہیں۔ یہ چھلانگ انسان کو مسائل کے گڑھے سے باہر نکالنے کے بجائے بارہا اسے مسائل کی دلدل میں مزید دھکیل دیتی ہے۔ میں نے مسائل کو دلدل سے سوچ سمجھ کر تشبیہ دی ہے۔ دلدل میں گرجانے والا انسان اگر سوچے سمجھے بغیر ہاتھ پاؤں چلانے کی کوشش کرے گا تو نہ صرف دلدل سے نکلنے کی اس کی کوشش کامیاب نہیں ہوگی بلکہ وہ مزید گہرائی میں پھنس سکتا ہے۔ دلدل سے نکلنے کا بنیادی طریقہ یہی ہوتا ہے کہ غور سے اردگرد کو دیکھا جائے۔ سب سے پہلے خارج سے مدد کے امکانات تلاش کیے جائیں کہ کوئی دوسرا شخص رسی پھینک کر ہمارے لیے دلدل سے نکلنا آسان کردے۔ یا پھر درخت کی کوئی ٹہنی یا شاخ کسی طرح ہاتھ آجائے جس سے

ہم باہر نکل سکیں۔ یہ دونوں راستے بند ہوں تو چلنے کے بجائے تیرنے کے انداز میں دلدلی زمین سے نکلنا زیادہ مفید ہوتا ہے۔

تاہم انسان یہ سب اس وقت کرے گا جب اسے یہ معلوم ہوگا کہ وہ گڑھے میں نہیں دلدل میں گرا ہے۔ یہی وہ بات ہے جس کی طرف میں توجہ دلا رہا ہوں کہ مسائل میں سب سے خطرناک رویہ یہ ہے کہ مسئلہ کی سنگینی کو پوری طرح سمجھے بغیر فیصلہ سازی شروع کردی جائے۔ یہ حرکت بالکل ایسے ہی ہے جیسے کوئی ڈاکٹر مرض کی تشخیص کیے بغیر نسخہ لکھنا شروع کردے۔ ڈاکٹر دوا دینے سے قبل مریض سے علامات سنتے ہیں اور پھر اپنے اطمینان کے لیے متعلقہ ٹیسٹ کراتے ہیں۔ اس طرح ان کے سامنے مرض کی مکمل صورتحال آجاتی ہے۔ درست تشخیص کے بغیر درست دوا دینا ممکن نہیں ہے۔ ٹھیک ایسے ہی مسئلہ کی تشخیص کیے بنا صحیح حل مل نہیں سکتا۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ مسئلے سے متعلق تمام بنیادی ڈیٹا، حقائق اور معلومات اکھٹی کرلیں۔ اور مسئلے کے تمام پہلوؤں کو اپنے سامنے لے آئیں۔

اس کی ایک مثال یہ ہے کہ آج کل بے روزگاری بہت بڑھ گئی ہے۔ نئے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے ساتھ ایسے بیروزگاروں کی تعداد میں بھی کثرت سے اضافہ ہورہا ہے جو ملازمتوں سے فارغ ہوگئے ہیں۔ بیروزگاروں کی بڑی تعداد معاش کی وجہ سے بہت پریشان رہتی ہے، مایوسی، ڈپریشن کے علاوہ معاشی تنگی، بےکاری کا احساس اور گھروں میں تلخی اس کے روزمرہ نتائج ہیں۔ بہت سے لوگ اس صورتحال میں پریشان ہوتے رہتے ہیں، مختلف جگہوں پر جاب کے لیے کہتے رہتے ہیں اور صالحین سے دعا کی درخواست کرتے ہوئے وقت گزارتے ہیں۔ حالانکہ وہ اگر حقائق جمع کرنا شروع کردیں تو وہ دیکھیں گے کہ زندگی میں کہیں نہ کہیں ان کے لیے موقع ضرور موجود ہے۔ اور اگر موقع نظر نہیں آتا تو انہیں اپنی کوئی نہ

کوئی کمزوری ضرور مل جائے گی۔ انہیں معلوم ہو جائے گا کہ ان کی صلاحیت یا علم میں کیا کمی ہے جس کی بنا پر انہیں جاب نہیں مل پا رہی۔ وہ وقت ضائع کرنے کے بجائے اپنی اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ وہ کوئی کورس کر سکتے ہیں، کوئی ٹریننگ لے سکتے ہیں۔ بارہا دیکھا گیا ہے کہ ملازمت انہی جگہوں سے نکل آیا کرتی ہے۔

حقائق اور تعصب

یہاں ایک اور اہم بات ہے جس کی طرف قارئین کی توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ بہت سے معاملات میں سارے اور مکمل حقائق سامنے رکھنے کی یہ بات اتنی سادہ نہیں رہتی جتنی نظر آتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اکثر جو مسائل ہمیں پیش آتے ہیں وہ ہمارے ذاتی ہوتے ہیں۔ ان میں بارہا ہمارے تعصّبات اور جذبات کا عمل دخل ہو جاتا ہے۔ یہ دونوں چیزیں اس بات کی اجازت نہیں دیتیں کہ ہم درست حقائق جمع کر سکیں۔ اس کا سب بڑا اظہار رشتے ناتوں کی خرابیوں کی شکل میں سامنے آتا ہے۔ قریبی رشتوں میں خرابی کی اصل وجہ یہ ہوتی ہے کہ جب ہم معاملے کو سمجھنے کی کوشش کر رہے ہوتے ہیں تو جذبات ہم پر غالب ہوتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں ہم میں اکثر جذبات میں تصویر کا صرف ایک رخ سامنے رکھتے ہیں اور فیصلہ کر دیتے ہیں۔ اس سے بڑی خرابی پیدا ہو جاتی ہے۔

اس مسئلے سے نمٹنے کا عملی طریقہ یہ ہے کہ جب کبھی حقائق جمع کرنے کا وقت ہو تو اپنے خلاف خود ایک وکیل کی طرح حقائق جمع کریں۔ یعنی اپنے لیے حقائق جمع کرنے کے بجائے ایک مخالف کے نظریے سے صورتحال کا جائزہ لیں۔ اس سے ہمیں اپنے ساتھ دوسروں کے زاویہ نظر کا نہ صرف اندازہ ہوگا بلکہ جذبات میں آ کر ہم کوئی فیصلہ کرنے سے قبل یہ دیکھ سکیں گے کہ حقیقت کو دیکھنے کا ایک دوسرا انداز بھی موجود ہے۔ بعض اوقات انسان اس قدر جذباتی ہو رہا ہوتا ہے کہ

دوسرے فریق کے نقطہ نظر پر غور کرنے کی کوشش ہی نہیں کرتا۔ ایسے میں ایک امکان یہ ہے کہ ہم اپنے بجائے کسی اور کے لیے ڈیٹا جمع کرنے کی کوشش کر دیں۔ اس سے بھی معاملے کی حقیقی تصویر سامنے آئے گی۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس عمل سے گزرے بغیر مسئلہ حل کرنے کی کوشش ہمیشہ بڑے نقصان پہنچاتی ہے۔

دوسرا نکتہ: حقائق کا غیر جانبدارانہ تجزیہ و تحلیل

مسئلے کے حل کی طرف پہلا قدم اگر سارے حقائق جمع کرنا ہے تو دوسرا قدم مسائل کا غیر جانبدارانہ تجزیہ و تحلیل ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسئلے کو اچھی طرح سمجھا جائے۔ تمام متعلقہ پہلوؤں اور فریقوں کو ذہن میں رکھا جائے۔ پھر کوئی ایسا حل ڈھونڈا جائے جس میں کم سے کم نقصان ہو۔ کسی مسئلے کو حل کرنے میں انسان کا کمال صرف یہ نہیں کہ کسی بھی قیمت پر کوئی مسئلہ حل کر دیا جائے۔ بلکہ اصل کمال یہ ہوتا ہے کہ ممکنہ حل کی کم سے کم قیمت دی جائے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب تمام حقائق کا اچھی طرح تجزیہ کر لیا جائے۔

اس کے دو آسان طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ مسئلے کو کسی قابل اعتماد اور سمجھدار شخص کے سامنے رکھا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ بیان کرنے سے بات، مسئلہ اور حل سب واضح ہو جاتے ہیں۔ بیان کرنے سے بارہا ہم دوسروں کو ہی نہیں بتاتے بلکہ خود بھی بہت سی چیزیں پہلی دفعہ جان لیتے ہیں۔ کیونکہ دوسرا آدمی سوال بھی اٹھاتا ہے اور اعتراض بھی کرتا ہے۔ اس کا مزید فائدہ یہ ہوتا ہے کہ مسئلہ سے متعلق کوئی اور تجربہ کار شخص ہمیں اچھا مشورہ بھی دے سکتا ہے۔

تاہم بعض لوگ دوسرے کو کسی راز میں شریک نہیں کرنا چاہتے یا ان کے اردگرد کوئی ایسا سمجھدار شخص موجود نہیں ہوتا۔ اس کا حل یہ ہے کہ مسئلے کے تمام پہلوؤں کو لکھ لیا جائے اور ساتھ ساتھ ممکنہ حل بمعہ ان کی قیمت کے بھی تحریر میں لائے جائیں۔ اس دنیا میں کوئی مسئلہ لاینحل نہیں

ہوتا۔اصل میں اس کی ایک قیمت ہوتی ہے جو ہم دے سکتے ہیں یا نہیں دے سکتے۔ہمیں ایسی قیمت دریافت کرنی ہوتی ہے جو ہم دے سکتے ہوں۔ایک سے زیادہ حل میں ہمیں کم از کم قیمت والا حل ڈھونڈنا ہوتا ہے۔

بولنے کی طرح لکھنے سے بھی انسان پر بہت کچھ واضح ہوجاتا ہے۔اس عمل میں چونکہ ذہن پریشانی سے ہٹ کر حل کی طوف متوجہ ہوجاتا ہے اس لیے ممکن ہے کہ لکھتے وقت خود ہی مسئلے کا اچھا حل سمجھ میں آجائے۔چنانچہ ایسے میں تمام ممکنہ اقدامات لکھیں اور ان میں سے بہترین ممکنہ قدم کی نشاندہی کر لیجیے۔

تیسرا نکتہ: کرڈالیے

تیسرا نکتہ بہت سادہ ہے۔جو حل سمجھ میں آگیا ہے اسے کرڈالیے۔تذبذب میں نہ رہیے۔ کیونکہ ایسے میں پریشانی، ذہنی انتشار اور ٹینشن کے عناصر آپ کی جان کا روگ بنے رہیں گے۔ یادرکھیے انسان کو اصل نقصان مسائل سے نہیں پہنچتا بلکہ اس ٹینشن اور پریشانی سے پہنچتا ہے جو اندر سے پیدا ہوتی ہے۔اس لیے جس وقت انسان ایک فیصلہ کرلیتا ہے اسے اس پر عمل کرلینا چاہیے۔اس کے بعد ہر طرح کی پریشانی ختم ہوجاتی ہے۔کیونکہ انسان پہلے ہی ہر قدم کا جائزہ لے چکا ہوتا ہے۔ناکامی کے ہر امکان کو سمجھ چکا ہوتا ہے اور کامیابی کی ہر قیمت کا اندازہ کر چکا ہوتا ہے۔اس کے بعد تذبذب میں رہنے کا کوئی فائدہ نہیں۔جو سوچا ہے اسے کرڈالیے۔

اس پورے عمل کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کا ذہن فکر و پریشانی میں الجھے رہنے کے بجائے مسئلے کے حل میں لگا رہتا ہے جو کہ اپنی ذات میں ایک بہت بڑی کامیابی ہے۔یہاں یہ بات بھی یاد رہنی چاہیے کہ زندگی میں بہت سے مسائل کا کوئی فوری حل نہیں ہوتا۔ایسے مسائل کو صبر اور انتظار کے خانے میں ڈالنا چاہیے اور اللہ تعالیٰ سے اجر کا طلبگار رہنا چاہیے۔یہ چیز

مذہبی اصطلاح میں تفویض و توکل کہلاتی ہے۔توکل کا مطلب ہوتا ہے کہ اسباب پورے کر کے کوئی اقدام کرنا اور تفویض کا مطلب ہوتا ہے کہ جہاں کوئی قدم اٹھانا بھی ممکن نہ ہو اس معاملے کو اللہ کے حوالے کر دینا۔یہ ایمان کا اعلیٰ ترین درجہ ہے۔

اس طریقے کو اختیار کر کے انسان مسئلہ حل کرے نہ کرے وہ چیز ضرور پالیتا ہے جس کے لیے مسائل حل کیے جاتے ہیں۔یعنی ذہنی سکون اور قلبی اطمینان۔انسان کی تمام جدوجہد اصل میں انہی چیزوں کے لیے ہوتی ہے۔یہ چیزیں اگر مسئلہ حل ہوئے بغیر اللہ کی عنایت سے صبر ،تفویض اور توکل سے مل جائیں تب بھی انسان اپنے اصل مقصد کو بہر حال پالیتا ہے

آخری بات اس ضمن میں یہ ہے کہ یہی پوراسہہ نکاتی فارمولا دوسروں کے لیے بھی موثر ہوتا ہے۔ چنانچہ جب کاروبار میں کوئی ملازم یا دوست احباب یا کوئی رشتے دار آپ کے پاس اپنا کوئی مسئلہ لائے تو انہیں اس سہہ نکاتی مرحلے سے گزرنے کے لیے کہیں۔آپ دیکھیں گے کہ اپنے مسائل میں بہت اچھا حل وہ خود ہی ڈھونڈ لیں گے اور اس طرح ان کی آئندہ کے لیے مزید بہترین تربیت ہوجائے گی۔

ہمارے بچے ہمارا سرمایہ ہیں

اولاد انسان کا بہترین سرمایہ ہے۔ یہ اس کی ذات کا تسلسل ہی نہیں، اس کی امیدوں اور خواہشوں کا سب سے بڑا مرکز بھی ہے۔ ہم میں سے کون ہے جو اپنی اولاد کے برے مستقبل کا تصور بھی کر سکے۔ لیکن اولاد کا اچھا مستقبل صرف خواہشوں اور تمناؤں کے سہارے وجود پذیر نہیں ہوسکتا۔ اس کے لیے ایک واضح اور متعین لائحہ عمل کی ضرورت ہے۔ آج کی ملاقات میں ہم اختصار کے ساتھ وہ لائحہ عمل بیان کر رہے ہیں جو دنیا اور آخرت دونوں میں آپ کی اولاد کو آپ کی آنکھوں کی ٹھنڈک بنا دے گا۔

غیر روایتی انداز میں لکھی گئی یہ تحریر تربیت کے جن اصولوں کو بیان کرتی ہے، انہیں اگر ملحوظ رکھا جائے تو وہ بچوں کے ساتھ ساتھ والدین کی بھی اخلاقی تربیت اور ذہنی نشو ونما کا سبب بنیں گے۔ اس کے نتیجے میں حاصل ہونے والا ذہنی سکون وہ چیز ہے جو دنیا میں انسان کی ہر تگ ودو کا مقصود ہوتا ہے۔ ایک ایسا گھر جہاں دنیا کے ہر ہنگامے سے محفوظ رہ کر انسان قلبی راحت پائے ہوئے ہو، بلاشبہ ایک عظیم نعمت ہے۔ یہ اصول آپ کے گھر کو ایسا ہی گھر بنا دیں گے اور آپ کی آئندہ نسلوں کو نہ صرف آپ کے لیے بلکہ پورے معاشرے کے لیے خیر کا باعث بنائیں گے۔

میں اس موقع پر قارئین کی توجہ اس امر کی طرف بھی مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ جب ایک اچھی بات آپ تک پہنچے تو اس پر عمل کے ساتھ ساتھ اسے دوسروں تک پہنچانا آپ کی اخلاقی ذمہ

داری ہے۔ چنانچہ کوشش کیجیے کہ اپنے جاننے والے ہر شخص تک اس تحریر کو پہنچائیں۔

ا) اچھے خیالات اچھی زندگی

عام طور پر والدین اولاد کا دامن خوشیوں سے بھر دینے کی فکر میں رہتے ہیں۔ خوشیوں سے ان کی مراد بالعموم مادی اشیا کی بہتات ہوتی ہے۔ تاہم خوشی صرف مادی اشیا سے نہیں ملتی۔ خوشی زندگی کے بارے میں مثبت نقطۂ نظر اختیار کرنے سے ملتی ہے۔ اس دنیا میں دکھوں، پریشانیوں اور ناپسندیدہ حالات سے مفر ممکن نہیں ہے۔ آپ کچھ بھی کر لیں، برے حالات سے اپنی اولاد کو بچا نہیں سکتے۔

ہاں ایک طریقہ ایسا ہے جس سے آپ کی اولاد پر مصائب و آلام کی آگ ٹھنڈی ہو سکتی ہے۔ وہ یہ کہ آپ اپنی اولاد کو زندگی کے بارے میں مثبت نقطۂ نظر دیں۔ اسے بتائیں کہ دنیا میں سخت حالات ہی بہترین انسانوں کو جنم دیتے ہیں۔ اس اعتبار سے یہ سختیاں خدا کی نعمت ہیں۔ یہ ایک طرف انسان کی صلاحیتوں کو بہترین طریقے سے پروان چڑھاتی ہیں اور دوسری طرف آخرت میں خدا کی رضا اور اس کی بہترین نعمتوں کے حصول کا ذریعہ بھی بنتی ہیں۔ چنانچہ بچوں کو یہ سبق دیں کہ وہ مشکلات کو چیلنج کے طور پر لیں۔ اس کے بعد وہی دکھ جو دوسروں کو نڈھال کر دیتے ہیں انہیں سرشار کر دیں گے۔

۲) سخت محنت کی عادت

اولاد کو دینے والی دوسری چیز سخت محنت کرنے کی عادت ہے۔ والدین لاڈ پیار میں بچوں کی زندگی آسان بنانا چاہتے ہیں۔ مگر بے جا لاڈ پیار مستقبل میں ان کی زندگی مشکل بنا دیتا ہے۔ لاڈ پیار سے بچے اکثر نکمے ہو جاتے ہیں۔ اس دنیا میں نکمے اور ناکارہ لوگوں کی کامیابی کا کوئی امکان نہیں۔ کامیابی صرف سخت محنت سے ملتی ہے۔ حتیٰ کہ ذہانت بھی محنت کے کندھوں پر بیٹھ کر ہی خود

کونمایاں کر پاتی ہے۔ انگریزی میں کہا جاتا ہے:

Genius is ninety percent perspiration and only tenpercent inspiration.

یعنی ذہانت نوے فیصد محنت ہے اور صرف دس فیصد دماغی صلاحیت۔

بچپن سے ہی اولاد کو سخت ذہنی اور جسمانی محنت کا عادی بنائیں۔ اس کام کے لیے بچوں کے بڑے ہونے کا انتظار نہ کریں۔ بڑے ہونے پر تو بچوں کی عادتیں پختہ ہو جاتی ہیں جن کا بدلنا آسان نہیں رہتا۔ عادتیں تو بچپن ہی میں ڈلوائی جاتی ہیں۔

۳) آپ کا بچہ آپ سے سیکھتا ہے

بچہ ایک مکمل نقال ہوتا ہے۔ وہ سب کچھ آپ سے یا آپ کے فراہم کردہ ماحول سے سیکھتا ہے۔ لہٰذا آپ بچوں کو جیسا بنانا چاہتے ہیں، ویسے ہی بن جائیں اور انہیں اُسی طرح کا ماحول فراہم کریں۔ جو بچہ ہر وقت گھر میں جھوٹ سنے گا، اس سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ کتاب میں جھوٹ کی برائی پڑھ کر وہ اس سے نفرت کرنے لگے۔ یہ ناممکن ہے۔

دورِ جدید میں ایک مسئلہ یہ پیدا ہو چکا ہے کہ بچوں کا اکثر وقت والدین سے زیادہ ٹی وی کے ساتھ گزرتا ہے۔ میڈیا کے اپنے مفادات ہوتے ہیں جن کے تحت وہ رومانویت، جنس اور تشدد کو بہت زیادہ ابھار کر دکھاتے ہیں۔ ایسے میں اگر آپ اپنے بچے کو صرف ٹی وی پر آنے والے پروگراموں کے حوالے کر دیں گے تو ان تمام چیزوں کے اثرات ان تک پہنچنا لازمی ہیں۔ اسی طرح مغربی تہذیب اور روایات کے بعض منفی اثرات اسی ذریعے سے آپ کے بچوں میں خاموشی سے منتقل ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا ضروری ہے کہ آپ اس معاملے کو سنجیدگی سے لیں۔ سستی تفریح حاصل کرنے کی آپ کی بظاہر بے ضرر خواہش، آپ کی اولاد کی دنیا اور آخرت دونوں

تاریک بنا سکتی ہے۔ چنانچہ بہتر ہوگا کہ آپ خود کو اور اپنی اولاد کو بھی میڈیا کے صرف انہی پہلوؤں تک محدود رکھیں جن کا تعلق علم اور اچھی تفریح سے ہو اور بچوں کو اس حد سے آگے نہ جانے دیں۔

۴) ذاتی توجہ اور براہِ راست مکالمہ

وہ دور گیا جب بچے خود سے پل جایا کرتے تھے۔ اب ہر بچہ ذاتی توجہ چاہتا ہے۔ آپ کی تمام تر احتیاط کے باوجود معاشرے میں موجود شر اور برائیوں کا آپ کے بچے تک پہنچنا لازمی ہے۔ یہ بچے سے آپ کا ذاتی تعلق ہے جو اسے ان برائیوں کے اثرات سے بچالے گا۔ بچوں سے آپ کا دوستانہ تعلق اور براہِ راست مکالمہ وہ ذریعہ ہے جس سے آپ ہر برائی کے بارے میں ان کے ساتھ کھل کر گفتگو کر سکیں گے اور انہیں یہ بتا سکیں گے کہ یہ چیزیں ہماری مذہبی اور تہذیبی اقدار کے خلاف ہیں۔ اس کے بغیر آپ کے بچے اپنے تجسس کو دور کرنے کے لیے ناسمجھ دوستوں، بیہودہ کتابوں اور دیگر ایسے ذرائع سے رجوع کریں گے جو ان کی ذہنی اور عملی گمراہی کا سبب بنیں گے۔

۵) بچوں کو اعلیٰ انسان بنائیے

بحیثیتِ مسلمان یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ دین کے بنیادی تصورات اپنے بچوں کو منتقل کریں۔ اس دنیا کا ایک بنانے والا ہے۔ اس نے ہماری رہنمائی کے لیے اپنے رسولوں کو بھیجا ہے۔ اس کی رہنمائی دین کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے۔ ہمیں ایک روز اپنے رب کے حضور پیش ہو کر اپنے اعمال کا جواب دینا ہے۔ اچھے اعمال والے جنت اور برے اعمال والے جہنم میں جائیں گے۔ یہ وہ بنیادی تصورات ہیں جن کی اپنی اولاد تک منتقلی ہماری بنیادی ذمہ داری ہے۔

اچھے اخلاقی تصورات مثلاً شرم و حیا، امانت و دیانت، صدق و عدل اور اس جیسی دیگر صفات کو بچوں کی شخصیت کا حصہ بنانا بھی والدین ہی کی ذمہ داری ہے۔ اسی طرح معاملات کو گفت و

شنید سے حل کرنا، سنی سنائی باتوں کے بجائے تحقیق کے ذریعے حقائق تک پہنچنا اعلیٰ انسانی خصلتیں ہیں۔ جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کہ آپ کا بچہ آپ ہی سے سیکھتا ہے اس لیے بچوں میں اعلیٰ دینی، اخلاقی اور انسانی صفات پیدا کرنے کے لیے آپ کو انہیں ایسا ہی بن کر دکھانا بھی ہوگا۔

۶) اچھی تعلیم اور ذوق کا لحاظ

مندرجہ بالا تمام چیزوں کے ساتھ بچوں کو ان کے ذوق کے مطابق اچھی تعلیم دلوانا بہت ضروری ہے۔ ابتدائی عمر سے ہی اچھی تعلیم کا مطلب مہنگے انگریزی اسکولوں میں پڑھانا ہی نہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس اسکول میں بھی یہ تعلیم حاصل کریں انہیں اس کے نصاب پر مکمل دسترس حاصل ہو۔ ایک عام اردو میڈیم سرکاری اسکول کا نصاب بھی بہت اعلیٰ ہوتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ یہ نصاب پورا پڑھایا جائے اور اس طرح پڑھایا جائے جیسا کہ اس کے پڑھانے کا حق ہے۔ چنانچہ آپ کی کوشش یہ ہونی چاہیے کہ آپ کا بچہ جس اسکول میں بھی جاتا ہو اس کے نصاب پر اسے پورا عبور حاصل ہو۔ اس کے لیے آپ کو بچے کی تعلیم میں ذاتی دلچسپی لینی چاہیے۔ مختلف طریقوں سے اس کی قابلیت کا امتحان لینا چاہیے۔

ہمارے ہاں ''رٹے'' کے جس نظام کے تحت بچوں کی قابلیت کو جانچا جاتا ہے وہ عملی زندگی میں انتہائی غیر مؤثر اور بچوں میں حقیقی قابلیت پیدا کرنے کے اعتبار سے قطعاً غیر مفید ہے۔ معاملہ تعلیم کا ہو یا تربیت کا، علم کو بچے کی شخصیت اور تجربات کا حصہ بننا چاہیے نہ کہ اس کی یادداشت کا۔ علم جب بچے کی شخصیت اور تجربات کا حصہ بنتا ہے تو وہ اس میں ایک خاص قسم کا ذوق تشکیل دیتا ہے۔ آپ اپنے بچے کے لیے جب اعلیٰ تعلیم کے مراحل کا انتخاب کریں تو اس کا انحصار بچہ کے اپنے ذوق پر ہونا چاہیے نہ کہ کسی پیشہ کی مالی منفعت پر۔ اپنے ذوق کے مطابق تعلیم

حاصل کرنے والے نوجوان ہمیشہ اپنے فن میں یکتا ثابت ہوتے ہیں۔ اپنے فن میں یہ مہارت اور دلچسپی نہ صرف انہیں مالی مسائل سے دوچار نہیں ہونے دیتی بلکہ وہ کام کر کے بھی ذہنی سکون حاصل کرتے ہیں۔ یہی ذہنی سکون انسان کا کل سرمایہ ہوتا ہے۔

۷) نئے خاندان کی مدد کیجیے

والدین کی آخری بنیادی ذمہ داری اپنے بچوں کا گھر بسانا ہوتا ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں اس معاملے میں نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کی تربیت کا کوئی اہتمام نہیں ہوتا۔ ان کی تربیت اگر ہوتی ہے تو صرف میڈیا کے ہاتھوں جس میں کوئی حسین دوشیزہ یا خوبرو نوجوان آئیڈیل بنا دیا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ معاشی مسائل کی بنا پر شادی کی عمر بہت بڑھ چکی ہے۔ ان وجوہات کی بنا پر نوجوانوں کے ذہن میں شادی کا تصور صرف دو جسموں کے ملاپ تک محدود رہتا ہے۔ خاندان کیا ہوتا ہے؟ یہ کیوں وجود میں آتا ہے؟ اس میں فریقین کی ذمہ داریاں کیا ہوتی ہیں؟ یہ اور ان جیسے دیگر اہم معاملات میں ہم اپنی اولاد کی کوئی رہنمائی نہیں کرتے۔

شادی کا مطلب ہمارے ہاں بس یہی ہے کہ اپنا بچہ جب کمانے کے قابل ہو جائے تو اس کے لیے مال و جمال کی حامل کسی لڑکی کا انتخاب کر لیا جائے۔ یہ لڑکی جب گھر آتی ہے تو وہ گھریلو سیاست اور بے انصافی شروع ہوتی ہے جس کا مقابلہ بین الاقوامی سطح کے شاطر سیاستدان بھی نہیں کر سکتے۔ چنانچہ غیر تربیت یافتہ اور تصوراتی دنیا میں پلے بڑھے یہ لڑکا لڑکی شادی کے ابتدائی سال بالعموم انتشار اور پریشانی کے عالم میں گزارتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ ان حالات کے عادی ہو جاتے ہیں اور جو کچھ ان کے ساتھ ہوا تھا، وہ زیادہ برے طریقے پر اپنی اولاد کے ساتھ کرنے لگتے ہیں۔

اس لیے ضروری ہے کہ خاندان کی تشکیل سے پہلے اور بعد میں والدین بھرپور طریقے سے اپنے بچوں کی مدد کریں۔ وہ خاندان کی تشکیل میں ان کی پسند کو مدنظر رکھیں۔ رشتہ کے انتخاب

میں مادی خوبیوں کے بجائے کردار واخلاق کی دیرپا اور محکم اساسات کو معیار بنائیں۔ ایک نئے خاندان کی تشکیل میں ہمیشہ یہ اصول ملحوظ رہے کہ اس کے نتیجے میں ایک خاندان میں بیٹا اور دوسرے میں بیٹی کا اضافہ ہوا ہے۔ یہ win-win معاملہ ہے جس میں کسی سے کچھ نہیں چھنا بلکہ ہر شخص فائدے میں رہا ہے۔ صرف اسی صورت میں نیا خاندان ایک مستحکم شکل اختیار کرے گا اور معاشرے میں جنم لینے والے انسانوں کی ایک بہترین تربیت گاہ وجود میں آجائے گی۔

مندرجہ بالا امور اختیار کرنے کے بعد امید ہے کہ آپ کی اولاد آپ کے اور معاشرے کے لیے ایک بہترین اور قابل فخر اثاثہ ثابت ہوگی۔ اس کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ سے اپنی اولاد کی اصلاح اور بہتری کے لیے دعا کرتے رہیں کیونکہ دعا مومن کا اصل ہتھیار ہے۔ بالخصوص قرآن کی یہ دعا تو ہر حال میں پڑھتے رہیں:

رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَ ذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّ اجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا

ترجمہ: اے ہمارے رب ہمیں اپنی بیویوں اور اپنی اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک دے اور ہم کو پرہیزگاروں کا امام بنا۔

اسلام، مسیحیت اور مسلمان

سیاست، علم اور تبدیلی

پیو ریسرچ سنٹر ایک غیر سیاسی تحقیقاتی فیکٹ ٹینک (FactTank) ہے جو ان رجحانات، رویوں اور معاملات سے متعلق معلومات جمع کرتا ہے جو امریکہ اور دنیا بھر میں تبدیلی کا باعث بنتے ہیں۔ اس ریسرچ سنٹر نے دسمبر 2011 میں ایک رپورٹ شائع کی ہے۔ جس کا عنوان درج ذیل ہے۔

Global Christianity

A Report on the Size and Distribution

of the World's Christian Population

اس ادارے کی رپورٹس ہمارے میڈیا میں اکثر شائع ہوتی ہیں، مگر اس ادارے کا تعارف بیان نہیں کیا جاتا۔ اس لیے میں دلچسپی رکھنے والے قارئین کے لیے اس ادارے کا مختصر تعارف بھی نقل کر رہا ہوں جو اسی رپورٹ کے آغاز میں درج ہے۔

The Pew Research Center is a nonpartisan fact tank that provides information on the issues, attitudes and trends shaping America and the world. The center conducts public opinion polling, demographic studies, content analysis and

other empirical social science research. It does not take positions on policy issues. The Pew Forum on Religion & Public Life is a project of the Pew Research Center; it delivers timely, impartial information on the issues at the intersection of religion and public affairs in the U.S. and around the world. The Pew Research Center is an independently operated subsidiary of The Pew Charitable Trusts.

130 صفحات پر مشتمل یہ تفصیلی رپورٹ دنیا بھر میں مسیحی آبادی کی تمام تر معلومات جزئی تفصیلات سمیت بیان کرتی ہے۔اس رپورٹ کی تیاری میں دوسو سے زائد ممالک کی آبادی کا جائزہ لیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ دنیا کے کن ممالک میں کتنے عیسائی ہیں۔ کہاں وہ اقلیت میں اور کس جگہ اکثریت میں ہیں۔ ممالک کے علاوہ براعظموں اور بڑی جغرافیائی اور نسلی اکائیوں کے حوالے سے بھی مسیحی آبادی کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔اس کے ساتھ اندرونی طور پر خود مسیحیت کے مختلف فرقوں مثلاً کیتھولک، پروٹسٹنٹ اور آرتھوڈاکس وغیرہ کی آبادی نیز ان کی جغرافیائی تقسیم یعنی کس فرقے کے لوگ مختلف ممالک میں کس تعداد میں آباد ہیں، یہ ساری تفصیلات بھی اس رپورٹ میں موجود ہیں۔

میں رپورٹ کے اہم مندرجات اور اس حوالے سے اپنی گزارشات پر تو بعد میں آؤں گا، مگر سچی بات یہ ہے کہ اتنی تفصیلی معلومات اور ڈیٹا کو ایک جگہ پر دیکھ کر میں بے اختیار ان لوگوں کو داد دینے پر خود کو مجبور پاتا ہوں۔ ہمارے ہاں تو جس شخص کو اللہ صلاحیت اور مقبولیت عطا کرتا ہے

اسے کرنے کا ایک ہی کام نظر آتا ہے۔ وہ یہ کہ سیاست کے میدان میں کود جائے۔ ہمارے ہاں آج تک لوگ یہ بات نہیں سمجھ سکے کہ علم، تعلیم، معلومات اور ادارے؛ معاشرے میں ترقی اور تبدیلی کی اساس ہوتے ہیں۔ یہ سب مل کر معاشروں میں فکری تبدیلی لاتے ہیں اور اس کے بعد جا کر سیاست کے ایوانوں اور میدانوں میں بامعنی تبدیلی آتی ہے۔ نوٹ کر لیجیے میں نے بامعنی تبدیلی کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اقتدار کے ایوان میں صرف تبدیلی آجانے سے کچھ نہیں ہوتا۔

رپورٹ کے اعداد شمار

اب آیئے رپورٹ کے مندرجات کی طرف۔ اس رپورٹ کے مطابق جو سن 2010 تک کے اعداد و شمار پر مبنی ہے مسیحیت دنیا میں اس قدر پھیل چکی ہے کہ دنیا کا ہر تیسرا شخص ایک مسیحی ہے۔ دنیا کی 6.9 ارب آبادی میں سے 2.18 ارب لوگ دین مسیحیت کے علمبردار ہیں۔ اس رپورٹ میں ایک اور اہم نکتہ یہ بیان ہوا ہے کہ مسیحیت جو پچھلے ہزار برسوں تک براعظم یورپ کا ایک مذہب تھی اب دنیا بھر میں پھیل چکی ہے۔ اس بات کو اعداد و شمار کی شکل میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ 1910 میں دنیا بھر کی مسیحی آبادی کا 66.3 فیصد حصہ یورپ اور 27.1 فیصد حصہ براعظم شمالی و جنوبی امریکا میں تھا۔ گویا ان دو براعظموں سے باہر مسیحی آبادی عملاً موجود ہی نہیں تھی۔

جبکہ ایک صدی بعد یعنی سن 2010 میں صورتحال یہ ہے کہ امریکہ میں 36.8% اور یورپ میں 25.9% مسیحی آباد ہیں۔ جبکہ صحرائے اعظم کے نیچے واقع افریقہ کا تمام علاقہ یا دوسرے الفاظ میں شمالی افریقہ کو چھوڑ وسطی اور جنوبی افریقہ میں 23.6% اور ایشیا پیسیفک کے علاقے میں 13.1% مسیحی آبادی موجود ہے۔ جبکہ باقی دنیا کے دیگر خطوں میں موجود ہیں۔ گویا کہ مسیحی آبادی کا چالیس فی صد حصہ اب یورپ اور امریکا سے باہر ہے جو ایک صدی قبل نہ ہونے کے برابر تھا۔

مسیحی مشنریوں کی کامیابی

یہاں میں ایک دو چیزوں کی طرف قارئین کی توجہ مبذول کرانا چاہوں گا۔ پہلی یہ کہ یورپ اور امریکہ میں جو آج بھی مسیحی آبادی کے بنیادی گڑھ ہیں آبادی میں اضافے کی شرح پیدائش کی بنیاد پر بہت کم ہے اور یہ معاملہ کم وبیش ایک صدی سے جاری ہے۔ دوسرے یہ کہ پچھلی صدی میں جو دو عظیم جنگیں لڑی گئیں وہ اصلاً براعظم یورپ کی مسیحی طاقتوں کے درمیان میں تھیں اور ان میں کروڑوں لوگ ہلاک ہوئے۔ تیسرا یہ کہ امریکہ اور خاص طور پر یورپ میں مقامی لوگوں کی ایک بڑی تعداد الحاد کو اختیار کر چکی ہے اور وہ خود کو مسیحیت سے وابستہ کہلانا پسند بھی نہیں کرتے۔ ان حقائق کی روشنی میں جو اصل بات سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ مسیحیت میں جو تمام تر فروغ ہوا ہے آبادی میں اضافہ کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ دراصل مسیحی مشنریوں کی غیر معمولی محنت، جدو جہد اور قربانی کا نتیجہ ہے۔

میں یہ بات اس پس منظر میں عرض کر رہا ہوں کہ ہمارے ہاں مسلمانوں کی آبادی میں اضافے پر بہت فخر کیا جاتا ہے، مگر درحقیقت یہ تمام تر اضافہ مسلم ممالک میں زیادہ شرح پیدائش کی بنا پر ہے۔ اس کا مسلمانوں کی دعوتی جدوجہد یا دین پھیلانے کی کسی کوشش سے کوئی تعلق نہیں۔ پچھلی کئی صدیوں سے کوئی نئی قوم اسلام کے دائرے میں داخل نہیں ہوئی۔ جس امریکہ اور یورپ کے بارے میں ہم بہت فخر کرتے ہیں کہ وہاں اسلام سب سے زیادہ تیزی سے پھیلتا ہوا مذہب ہے اس میں بلاشبہ تبدیلی مذہب کا عنصر بھی شامل ہوتا ہے لیکن دیگر اہم وجوہات میں کثرت سے مسلمانوں کی یورپ اور امریکہ ہجرت اور وہاں بھی ان کی شرح پیدائش میں مقامی لوگوں سے زیادہ اضافہ شامل ہے۔

جبکہ آپ دیکھ لیجیے کہ مسیحی مبلغین بڑے فخر سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ پچھلی ایک صدی میں انہوں

نے افریقہ اور ایشیا پیسفک کے ممالک کی کئی اقوام کو مسیحیت کے دائرے میں شامل کیا ہے۔ مثلاً وسطی اور جنوبی افریقہ میں مسیحیوں کی آبادی کا تناسب ایک صدی قبل صرف 1.4% تھا جو اب 23.6% ہو چکا ہے۔ جبکہ ایشیا پیسفک میں ان کی تعداد میں تین گنا اضافہ ہوا ہے۔

مسلمان اور شرک کا فروغ

مجھے احساس ہے کہ آج کا مسلمان فخر کی جس نفسیات میں جینے کا عادی ہے، اسے میری باتیں اچھی نہیں لگ رہی ہوں گی۔ آج کا مسلمان صرف وہ جذباتی باتیں سننا چاہتا ہے جو اس کے دل کو بھائیں۔ مسلمانوں کی عظمت رفتہ کی بحالی، مسلمانوں کو دوبارہ دنیا کی سپر پاور بنانے کی باتیں، اپنی ہر کمزوری کی وجہ غیر مسلم طاقتوں کی سازشوں کو قرار دینا وغیرہ یہ وہ باتیں ہیں جنھیں کر کے میں اپنی مقبولیت میں بہت اضافہ کر سکتا ہوں۔ لیکن اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے وفاداری کا تقاضہ ہے کہ لوگوں کو ان کی ذمہ داری کا احساس دلایا جائے، چاہے کسی جذباتی اور سطحی آدمی کو یہ باتیں کتنی بری کیوں نہ لگیں۔ لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد ایسی ہے جو بہر حال اب بھی سچ سن کر اپنی اصلاح کرنا چاہتی ہے۔

سچ یہ ہے کہ مسیحیت کا فروغ شرک کا فروغ ہے۔ اس شرک پر اللہ تعالیٰ نے اپنا تبصرہ کیا ہے وہ خود قرآن کریم میں ملاحظہ فرمائیے۔ اللہ کی اولاد بنائے جانے کے مشرکانہ عقیدے پر اللہ تعالیٰ اس طرح تبصرہ کرتے ہیں:

> اور یہ کہتے ہیں کہ خدائے رحمان نے اولاد بنا رکھی ہے۔ یہ تم نے ایسی سنگین بات کہی ہے کہ قریب ہے کہ اس سے آسمان پھٹ پڑیں، زمین شق ہو جائے اور پہاڑ دھماکے کے ساتھ گر پڑیں کہ انہوں نے خدا کی طرف اولاد کی نسبت کی۔ (مریم 88-91:19)۔

ایک حدیث قدسی میں شرک کے بارے میں یہ بیان ہوا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کو گالی دینے کے مترادف ہے، (صحیح الجامع رقم: 4323)۔

یہ قرآن وحدیث میں شرک پر تبصرہ ہے۔ جبکہ ہمارا حال یہ ہے کہ ہم ہر سال زور وشور سے میلاد النبی مناتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ محبت رسول کا حق ادا کر دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں ڈنمارک میں گستاخی ہو جائے تو ہر طرف آگ لگ جاتی ہے۔ آہ مگر اللہ کو گالیاں دینے والے بڑھتے جا رہے ہیں اور کسی کی پیشانی پر شکن تک نہیں آتی۔ کسی کی نیند حرام نہیں ہوتی۔ قوموں کی قومیں حلقہ مسیحیت میں داخل ہو کر اللہ کو گالیاں دے رہی ہیں، مگر افسوس کہ توحید کے نام لیوا کچھ اور ضروری کام کر رہے ہیں۔ اگر فارغ ہو گئے تو شاید کچھ اس بارے میں سوچ لیں۔

آج کوئی نہیں جو خدا کی عظمت کا علم اٹھا کر، محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی سچائی اور آپ کے لائے ہوئے پیغام توحید کو مقصد بنا لے۔ یہاں تو فرقہ پرستی ہے، اسلاف پرستی ہے، قوم پرستی ہے، ظاہر پرستی ہے، نہیں ہے تو سچی خدا پرستی نہیں ہے۔

یہ ملاقات صرف اس نوٹ پر ختم کر رہا ہوں جو شائد کسی دردمند شخص کو اپیل کر جائے۔ یہ رپورٹ صرف یہ بتا رہی ہے کہ دنیا کا ہر تیسرا انسان نادانستگی میں اللہ تعالیٰ کو گالیاں دے رہا ہے۔ اور ہم اس آسمان کے نیچے اور زمین کے اوپر واحد گروہ ہیں جو لوگوں کی اس غلط فہمی کو دور کر سکتے ہیں۔ مگر یہاں کون ہے جو توحید کا علم ہاتھ میں اٹھا کر لے کر ہدایت کی شمع سے شرک کے اندھیروں کو مٹانے کا عزم کر لے؟

مشاہداتِ سفر

میں سفر کرنے کو پسند نہیں کرتا، مگر عام طور پر مجھے دوسرے لوگوں کی بنسبت زیادہ سفر کرنا پڑتا ہے۔ یہ چیز میرے لیے باعثِ مشقت ہو جاتی ہے مگر سفر کا ایک پہلو ایسا ہے جس کی بنا پر یہ مجھے کچھ نہ کچھ دے کر ہی جاتا ہے۔ وہ یہ کہ سفر انسان کو اس کی معمول کی زندگی سے نکال کر غیر معمولی حالات میں لے جاتا ہے۔ نئے لوگوں سے ملنا، نئے حالات وواقعات سے سابقہ پیش آنا اور نئی جگہوں اور مقامات سے واقفیت ہو جانا، سفر کی وہ خوبیاں ہیں جو سوچنے والے ذہن کو زندگی دیتی ہیں۔ سفر کا احساس سوچ کی وہ آنکھیں کھول دیتا ہے جو عام حالات میں بند رہتی ہیں۔ چنانچہ میں جب کبھی حالت سفر میں ہوتا ہوں تو اپنے ساتھ پیش آنے والے حالات وواقعات کو اپنے ذہن کی غذا بنانے کی کوشش کرتا ہوں۔

میرا ٹی وی پروگرام کئی برس تک میرے اپنے شہر میں ہونے کے بعد لاہور منتقل ہو گیا۔ جس کے نتیجے میں ٹی وی پروگراموں کی ریکارڈنگ کے لیے مجھے پچھلے کئی ماہ سے مسلسل ہوائی سفر کرنا پڑ رہا تھا۔ اس دوران میں مختلف مواقعوں پر پیش آنے والے مشاہدات وتاثرات کبھی صفحۂ ذہن پر اپنے نقش چھوڑ گئے اور کبھی میں انہیں صفحۂ قرطاس (Writing Paper) پر منتقل کرنے میں بھی کامیاب ہو گیا۔ میں آج کی ملاقات میں ان تاثرات میں آپ کو بھی شریک کرنا چاہتا ہوں۔ تاہم بیان میں ربط پیدا کرنے کے لیے میں ان تمام واقعات ومشاہدات کو ایک ہی سفر

کے پس منظر میں بیان کروں گا۔

مرد اور عورت

دورانِ سفر میری عادت ہے کہ اگر ضرورت ہو تو میں جہاز کے واش روم کو استعمال کرنے کے بجائے ایئر پورٹ لاؤنج کے واش روم کے استعمال کو ترجیح دیتا ہوں۔ کیونکہ جہاز کے سفر میں واش روم جانا پاس بیٹھے لوگوں کے لیے بھی باعث زحمت ہوتا ہے اور جہاز کے تنگ واش روم کی بنسبت ایئر پورٹ کے واش روم کشادہ ہوتے ہیں۔ ایک دفعہ واش روم جاتے ہوئے میں نے یہ غور کیا دنیا بھر میں مرد و خواتین کے بیت الخلا الگ الگ بنے ہوتے ہیں۔ اس سے مجھے یہ خیال آیا کہ جو لوگ مرد و عورت کو بالکل برابر سمجھتے ہیں وہ اس بارے میں کیا تبصرہ کریں گے۔ یہ معاملہ صرف واش روم ہی کا نہیں بلکہ بہت سے دیگر معاملات میں بھی یہی حال ہے۔ مثلاً کھیل کے ہر میدان میں بھی مرد و زن کی یہ دوئی صاف دیکھی جا سکتی ہے جہاں کبھی کسی مرد کا مقابلہ کسی خاتون سے نہیں بلکہ ہمیشہ اپنے جیسے ایک مرد سے ہوتا ہے۔ جبکہ خواتین کا مقابلہ خواتین سے ہوتا ہے۔ واش روم کی مثال یہ بتاتی ہے کہ مرد و عورت نفسیاتی طور پر جدا ہیں تو کھیلوں کی مثال یہ بیان کرتی ہے کہ جسمانی طور پر بھی مرد و زن الگ الگ ہوتے ہیں۔ یہ بات اس وقت بالکل واضح ہو جاتی ہے جب مرد و خواتین دونوں کو کسی میدان عمل میں کام کرنے کے یکساں مواقع ملتے ہیں۔ مثال کے طور پر دنیا بھر کے کاروباری اداروں میں کام کرنے والے مرد اور خواتین کا ڈیٹا دیکھ لیں تو معلوم ہو جائے گا کہ کون سی پوزیشن پر کون سی صنف کے لوگ زیادہ ہیں۔ افراد کی صلاحیتوں سے قطع نظر مرد جسمانی اور ذہنی طور پر زیادہ دباؤ برداشت کر سکتے ہیں اور زیادہ جارحانہ انداز میں معاملات کر سکتے ہیں۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہیں کہ عورتیں مردوں سے کوئی کمتر مقام رکھتی ہیں۔ بحیثیت انسان اللہ

تعالیٰ نے دونوں کو یکساں طور پر پیدا کیا ہے۔ بلکہ زندگی کے بہت سے ایسے معاملات اور مقامات ہیں جہاں خواتین ہی برتر حیثیت رکھتی ہیں۔ مگر یہ بہر حال ایک حقیقت ہے کہ عورتیں مردوں سے مختلف ضرور ہوتی ہیں۔ یہی وہ پس منظر ہے جس میں اسلام نے اپنے بہت سے احکام میں خواتین اور مردوں میں فرق کیا ہے۔ مثلاً خاندانی معاملات میں شوہروں کو ایک درجہ زیادہ دیتے وقت، مرد و زن کے اختلاط کے موقع پر خواتین کو زیادہ ذمہ داری دیتے وقت اللہ تعالیٰ مرد و زن کے درمیان اسی فرق کی رعایت کرتے ہیں۔ اسی طرح بعض معاملات مثلاً نماز میں خواتین کو جزئی اور جہاد اور کسبِ معاش (Bread Earning) وغیرہ میں مکمل رعایتیں دی گئی ہیں اور یہ ذمہ داریاں ان پر ڈالی ہی نہیں گئیں۔

مذہب اور تہذیب

میری فلائٹ کی نوعیت عام طور پر کچھ اس طرح رہی ہے کہ عام طور پر جمعہ کی اذان ایئر پورٹ پر ہو جاتی ہے۔ میں نے کئی دفعہ اس چیز کو غور سے دیکھا ہے کہ جیسے ہی اذان شروع ہوئی لاؤنج میں موجود تمام ادھیڑ عمر خواتین نے غیر شعوری طور پر اپنے دوپٹوں کو سر پر ڈال لیا۔ جبکہ کسی جوان خاتون یا نوجوان لڑکی نے یہ کام نہیں کیا۔

دوپٹہ مذہب اور تہذیب کی یکجائی کا ایک انتہائی خوبصورت اظہار ہے۔ یہ نسوانی لباس کا بڑا خوبصورت جز وقتی حصہ ہے۔ گھر کے کام کاج کرتے وقت خواتین اسے کونے میں رکھ دیتی ہیں۔ اپنی خواتین، شوہر اور چھوٹے بچوں کے سامنے بھی وہ اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتیں۔ مگر جب اس دائرے سے باہر لوگوں سے معاملہ پڑے تو اپنی زینت اور نسوانیت کے اخفا کے لیے وہ بڑے سلیقے سے اسے استعمال کرتی ہیں۔ جبکہ کسی بزرگ کی تعظیم کے لیے اس کا سر پر لیا جانا بھی ہماری ایک اعلیٰ ترین تہذیبی روایت رہی ہے۔ اسی پس منظر میں مسلمانوں کے گھروں میں یہ

عام دستور رہا ہے کہ خواتین چاہے گھر میں تنہا ہوں جیسے ہی اذان کی صدا بلند ہوتی ہے وہ سر پر دوپٹہ لے لیتی ہیں۔ یہ نہ صرف اللہ تعالیٰ سے بے پناہ محبت اور اس کی تعظیم کا ایک غیر معمولی اظہار ہے بلکہ یہ خاتون کی طرف سے اس بات اشارہ بھی ہے کہ میں اذان سنتے ہی نماز کے لیے تیار ہوں، کیونکہ مردوں کے برعکس عورتوں کے لیے نماز میں سر پر دوپٹہ لینا نماز کا ایک شعار ہے۔

مگر اب زمانہ بدل رہا ہے۔ دوپٹہ اب جتنا کچھ باقی ہے وہ فیشن کے طور پر باقی ہے۔ سر پر اسے لینے کا رواج کم وبیش ختم ہو چکا ہے۔ پچھلی نسل کی خواتین ہیں جو اذان کے وقت اسے سر پر لے لیتی ہیں۔ انہوں نے اپنی اگلی نسلوں کو یہ بات نہیں سکھائی اس لیے وہ ایسا نہیں کرتیں۔ اب خواتین اپنی اگلی نسلوں کی تربیت نہیں کرتیں، وہ انہیں ٹی وی کے حوالے کر دیتی ہیں۔ ٹی وی کی پروردہ لڑکیاں سر پر دوپٹہ نہیں لیتیں۔ اذان کے وقت بھی نہیں۔ اس طرح سر سے دوپٹہ ہی نہیں جاتا، خدا کا احترام بھی چلا جاتا ہے۔ اور آخر کار نماز بھی چلی جاتی ہے۔ نماز کے بعد پھر ایمان بھی چلا جاتا ہے۔ خدا پر ایمان چلا جائے تو زندگی میں شیطان آ جاتا ہے۔ پھر اس کے بعد اس کا پورا امکان پیدا ہو جاتا ہے کہ انسان کی منزل جنت کے بجائے جہنم بن جائے۔ وہ جہنم جہاں کی بھڑکتی ہوئی آگ سرکشوں کی کھال کو ادھیڑ دے گی۔ پھر حکم ہوگا تو دوبارہ نئی کھال آئے گی اور پھر یہی سرخ وسیاہ آگ اپنا خراج لینے پہنچ جائے گی۔ بیٹیوں کو ٹی وی کے حوالے کر دینے والی ماؤں کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے۔ اپنی اولادوں کی معمولی تکلیف پر بے چین ہو جانے والوں کو چاہیے کہ وہ انہیں جنت کی حسین بستی کے لیے تیار کریں نہ کہ جہنم کے عذاب کے لیے۔

اشتہار اور داعی

ایئر پورٹ پر جگہ جگہ مختلف اشتہارات لگے ہوئے تھے۔ ایک اشتہار لائف انشورنس کا تھا۔ اس میں ایک شادی شدہ جوڑا دکھایا گیا تھا۔ میں نے یہ نوٹ کیا کہ اشتہار میں لڑکی کو کم عمر

اور شوہر کو 40 کے قریب کا ایک آدمی دکھایا گیا تھا۔ عمر کے اس فرق سے دیکھنے والے مردوں کو غیر محسوس طریقے پر یہ بات باور کرائی گئی تھی کہ وہ اپنی بیوی سے پہلے دنیا سے گزر جائیں گے، اس لیے بیوی بچوں کی فکر کرتے ہوئے انشورنس کر لینی چاہیے۔ یہ بات الفاظ میں کہنا قطعاً نامناسب تھا، اس لیے یہ غیر محسوس طریقہ اختیار کیا گیا۔

مارکیٹنگ اور اشتہارات کی صنعت دور جدید میں ایک انتہائی ترقی یافتہ صنعت ہوگئی ہے۔ اس کا مقصد چونکہ انسانوں کو متاثر کر کے اپنی مصنوعات خریدنے پر آمادہ کرنا ہوتا ہے اس لیے دیگر چیزوں کے علاوہ انسانی نفسیات کی رعایت بھی کی جاتی ہے۔ یہی معاملہ ایک داعی کا ہونا چاہیے۔ وہ دنیا میں جنت کی جو پروڈکٹ بیچنے نکلتا ہے، اس کے لیے انسانی نفسیات اور انسانوں کی ذہنی استعداد کا بڑا خیال کرنا ہوتا ہے۔ مگر اول تو ہمارے ہاں کے دینی لوگ سوائے جنت کے ہر چیز کی طرف بلاتے ہیں۔ اور جو لوگ جنت کی طرف بلاتے بھی ہیں وہ طے کر لیتے ہیں کہ حکمت اور سلیقہ نام کی کوئی چیز اس دنیا میں نہیں پائی جاتی، سننے والا کوئی نفسیات نہیں رکھتا بلکہ جو ہم نے برے بھلے طریقے سے کہہ دیا ہے اسے وہ مان لینا چاہیے وگرنہ ساری برائی اسی میں ہے، ہم پر کوئی ذمہ داری نہیں۔ ہمارے داعی نہ دین سمجھنے میں ذمہ داری کا مظاہرہ کرتے ہیں اور نہ اسے سمجھانے میں۔ ایسے میں اگر باشعور لوگ دین کی طرف نہیں آتے تو اس میں کچھ بھی عجب نہیں۔

مسافر اور منزل

دوران سفر ہر شخص یہ دیکھ سکتا ہے کہ ائیر پورٹ لاؤنج میں بیٹھے ہوئے لوگ کھاتے پیتے بھی ہیں اور دیگر ضروریات بھی پوری کرتے ہیں۔ مگر اس دوران میں ان کی ساری توجہ صرف اس گیٹ کی طرف لگی رہتی ہے جس سے گزر کر انہیں جہاز میں بیٹھنا ہوتا ہے۔ جیسے ہی اعلان ہوتا ہے وہ فوراً جہاز میں سوار ہونے کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

ایک مومن دنیا میں اسی طرح جیتا ہے۔ پیدائش، جوانی، شادی، گھر بار، اولاد وغیرہ اس کے لیے اسی طرح زندگی کے مراحل ہیں جس طرح ایک مسافر ائیر پورٹ کے مختلف مراحل سے گزر کر آخر میں لاؤنج میں جا کر بیٹھ جاتا ہے۔ وہ دنیا کو ائیر پورٹ لاؤنج ہی سمجھتا ہے جہاں ضرورت کا ہر کام وہ کرتا ہے مگر اس کی ساری توجہ صرف اس طرف رہتی ہے کہ کب پروردگار کی طرف سے میرا بلاوہ آ جائے اور میں جنت کی اس منزل پر پہنچ جاؤں جہاں بہترین خوشیاں اور راحتیں میرا انتظار کر رہی ہیں۔ مگر افسوس کہ آج ہم مسلمان بھی دنیا کے اسی طرح دیوانے ہو چکے ہیں جس طرح دیگر اقوام ہیں۔ وہ اگر یہ کرتے ہیں تو ان کے پاس یہ جواز ہے کہ وہ آخرت کے تصور سے واقف ہی نہیں۔ مگر ہمارا قرآن تو جنت و جہنم کے تذکرے سے بھرا ہوا ہے۔ ہمارے پاس آخرت فراموشی کا کیا عذر ہے؟

بسنت

میں اس دفعہ بسنت کے موقعے پر لاہور میں موجود تھا۔ بسنت پنجاب کا ایک موسمی تہوار ہے جو سرما کے ٹھنڈے موسم کے بعد آمد بہار کی علامت اور خوشی کے اظہار کے طور پر منایا جاتا ہے۔ کسان سارا سال کی سختیوں کو جھیل کر زمین کے سینے سے اپنی معاش کے اسباب پیدا کرتے ہیں۔ بہار کا موسم ان فرزندانِ زمین کے لیے خوشیوں کی یہ نوید لے کر آتا ہے کہ زمین کی طرح اب آسمان بھی چند مہینے ان پر مہربان رہے گا اور وہ موسم کی سختیوں سے محفوظ رہیں گے۔ بہار کو ہندی زبان میں بسنت کہتے ہیں۔ اسی مناسبت سے یہ تہوار بسنت کہلاتا ہے۔ جبکہ اس موقع پر ہرے ہرے کھیتوں میں سرسوں کے پیلے پھولوں کی لہلہاتی ہوئی فصل کی مناسبت سے لوگ پیلے اور ہرے لباس زیب تن کرتے ہیں۔ خوشیوں کے اس موسمی تہوار میں مختلف عناصر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ داخل ہوتے رہے ہیں۔ ان میں سب سے اہم پتنگ بازی ہے۔

پچھلے کئی برسوں سے ہمارے ملک کے مذہبی حلقوں کی طرف سے بسنت کے خلاف مختلف حوالوں سے آواز اٹھائی جا رہی تھی۔ مثلاً یہ کہ یہ ہندو تہذیب کا ایک تہوار ہے۔ کچھ لوگوں نے یہ کہا کہ مغل دور میں کسی ہندو کو اس جرم میں سزائے موت دی گئی تھی کہ اس نے مسلمانوں کی مقدس ہستیوں کے بارے میں نازیبا باتیں کہی تھیں۔ یہ تہوار اس کی یاد میں منایا جاتا ہے۔ کچھ نے کہا کہ اس موقع پر ہونے والے رقص و موسیقی کی بنا پر یہ تہوار بند ہونا چاہیے۔ کچھ کے نزدیک یہ اسراف پر مبنی ایک تہوار ہے۔ تاہم پچھلے کچھ عرصے میں جو سب سے زیادہ سنگین مسئلہ سامنے آیا ہے وہ پتنگ کی ڈور سے معصوم بچوں کی ہلاکت کا مسئلہ ہے۔ اس کے علاوہ بسنت کے موقع پر فائرنگ، کرنٹ لگنے اور چھتوں سے گرنے سے بھی بہت سے لوگ ہلاک ہو جاتے ہیں۔

انسانی جانوں کے اس ضیاع پر لوگوں کے سخت احتجاج پر سن 2005 سے سپریم کورٹ نے پتنگ بازی پر پابندی لگا رکھی ہے مگر حکومت پنجاب نے بسنت کے موقع پر دو دن کے لیے یعنی 24 اور 25 فروری کے لیے پتنگ بازی کی اجازت دے دی تھی۔ اس موقع پر پہلی دفعہ تعطیل کا بھی اعلان کیا گیا تھا۔ بسنت نائٹ کے موقع پر شہر کے بیشتر حصے کو روشنیوں سے سجا دیا گیا تھا۔ ان روشنیوں کو میں نے اسٹوڈیو تک جاتے ہوئے راستے میں دیکھا۔ یہاں لوگوں نے مجھے بتایا کہ اصل بسنت پرانے شہر میں منائی جا رہی ہے جہاں رات کا سناٹا دور کرنے کے لیے زور دار میوزک اور فائرنگ اور اس کے اندھیرے کو بھگانے کے لیے روشنیوں کا زبردست اہتمام کیا گیا ہے۔ ساری رات لوگ اپنی چھتوں پر چڑھے رہیں گے اور پتنگ بازی کر کے 'بوکاٹا' کے نعرے لگاتے رہیں گے۔ جبکہ طبقہ امرا کے علاقوں میں بسنت پر پتنگ بازی کا اتنا اہتمام نہیں تھا۔ لاہور میں دوستوں نے بتایا کہ ان علاقوں میں دوسری قسم کی 'پتنگ بازی' ہوتی ہے جس کے لیے چھت پر چڑھنا ضروری نہیں بلکہ چھت کے نیچے رہنا بہتر ہوتا ہے۔

دن چڑھے تک لوگ سوتے رہے اور دوپہر کے بعد سے ایک دفعہ پھر لاہور شہر کے آسمان پر ہر طرف پتنگیں چھا گئیں۔ جب یہ ہنگامہ ختم ہوا تو ایک دفعہ پھر بچوں سمیت کئی قیمتی جانیں ضائع ہو چکی تھیں۔ لاہور میں ڈور پھرنے سے ہونے والا جانی نقصان اس دفعہ نسبتاً کم تھا۔ کیونکہ ایک طرف تو لوگ اپنی موٹر سائیکل پر باہر نہیں نکل رہے تھے اور جو نکلے انہوں نے ایک تار اپنی اسکوٹر کی ہیڈ لائٹ سے لے کر پچھلے اسٹینڈ تک نصف دائرے کی شکل میں لگا رکھا تھا۔ اس طرح وہ اس قاتل ڈور کی زد سے محفوظ رہتے جو لمحے بھر میں گلے کو صابن کی طرح کاٹ ڈالتی ہے۔

میرا اپنا تاثر یہ ہے کہ بسنت اب ایک سیاسی مسئلہ بن گیا ہے۔ جس میں ایک طرف حکومت ہے جو اسے روشن خیالی کی علامت سمجھتی ہے اور دوسری طرف مذہبی عناصر ہیں جو اس موقع پر ہونے والے دھمال، بھنگڑے، ناچ گانے اور بعض دوسری چیزوں کو مذہبی تعلیم کے خلاف سمجھ کر اس کے خلاف سراپا احتجاج بن جاتے ہیں۔ حالانکہ اب یہ ایک انسانی مسئلہ بن چکا ہے۔ معصوم بچوں اور لوگوں کی ہلاکت کے بعد تمام باشعور عناصر اس ہنگامے کے سخت خلاف ہو چکے ہیں جس کی وجہ سے بے گناہوں کی جان جاتی ہے۔ تاہم میں نے یہ دیکھا کہ عام لوگوں میں اس تہوار کے لیے ایک زبردست جوش و خروش پایا جاتا ہے۔ انسانی جان کو ہر شخص محترم سمجھتا ہے مگر ابھی ہمارے عوام کا شعور اتنا بلند نہیں ہوا ہے کہ وہ حکومت یا مذہبی رہنماؤں کی اپیل پر پتنگ بازی چھوڑ دیں گے۔ جہاں تک پابندی کا سوال ہے تو یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم ہر مسئلے کا حل قانونی پابندی کو سمجھتے ہیں۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں انسانی جان کی حرمت اور اس کا احترام ابھی دلوں میں راسخ نہیں ہوا ہے۔ پھر یہاں ہر شخص صرف اپنی ذات کا اسیر ہے۔ جب تک اپنے اردگرد کوئی جنازہ نہ اٹھے، عام لوگوں کے کان پر جوں نہیں رینگتی۔ 80 لاکھ کی آبادی کے شہر لاہور میں چند لوگوں کا مرنا فی صد کے حساب سے بہت کم ہے۔ اس لیے معصوم لوگوں کی ہلاکت سے براہ

راست متعلق ہونے والے لوگوں کی تعداد بہت کم ہوتی ہیں۔ میڈیا کے ذریعے سے اس طرح کی خبریں ہر چند کے بہت عام ہو جاتی ہیں، مگر یہی میڈیا بسنت پر ہونے والی خرافات کو انتہائی رنگین اور گلیمرس انداز میں پیش کر رہا ہوتا ہے۔ جس سے لوگوں میں بسنت منانے کا جوش و خروش بڑھ جاتا ہے۔

اہم بات یہ ہے کہ لوگوں کی تفریحات پر نہ پابندی لگائی جائے اور نہ انہیں بالکل بے لگام چھوڑا جائے۔ اصل کرنے کا کام معاشرے میں اعلیٰ انسانی اقدار کا فروغ ہے۔ جان کی حرمت ان میں سے ایک بنیادی چیز ہے۔ اسی طرح جس پیمانے پر اسراف بسنت کے موقع پر ہوتا ہے اس پر بھی لوگوں کی توجہ دلانے کی ضرورت ہے۔ تربیت اصل میں کرنے کا کام ہے۔ اور ساتھ ساتھ قانونی اقدامات سے اس بات کو بھی یقینی بنانا چاہیے کہ معصوم لوگوں کی جان محفوظ رہے۔

فرسٹ کلاس اور اکانومی کلاس

واپسی پر میں ائیر پورٹ کے چیک ان کاؤنٹر کے پاس پہنچا تو میں بے دھیانی میں PIA کے کلب کلاس کاؤنٹر کے پاس چلا گیا۔ وہاں ڈیوٹی پر موجود صاحب نے بڑے ادب سے سلام کیا مگر میرا ٹکٹ دیکھ کر کہا کہ آپ اگلے کاؤنٹر پر تشریف لے جائیں۔ اس نیم رسوائی کے بعد مجھے خیال آیا کہ ہمارے جیسے مذہبی لوگ خود کو رب العالمین کے چہیتے سمجھتے ہیں۔ مگر موت کے بعد جب وہ اعلیٰ ترین جنتیوں کے ساتھ جا کر کھڑے ہونے کی کوشش کریں گے تو فرشتے ان کی ساری غلط فہمی دور کر دیں گے۔ اور یہ نیم رسوائی نہیں، مکمل رسوائی ہوگی۔

جہاز سے اترتے وقت بھی میں نے دیکھا کہ کلب کلاس کے لوگوں کو پہلے موقع دیا گیا۔ انہی کا سامان بیلٹ پر پہلے آیا۔ ان کے لیے پورٹر مہیا کیے گئے تھے۔ اسی طرح کی مختلف نوعیت کے ترجیحی معیارات ہیں جو زیادہ پیسے دے کر اعلیٰ کلاس میں سفر کرنے والوں کے لیے مقرر کیے

جاتے ہیں۔ مجھے خیال آیا کہ اللہ تعالیٰ نے جنت کی ابدی بستی میں بھی دو کلاسیں بنا رکھی ہیں۔ ایک وہ لوگ جنہوں نے دینی احکام پورا کرتے وقت خود کو فرائض تک محدود رکھا اور دوسرے وہ لوگ جو قربانی کے مقام پر جا کر اور اپنے تعصّبات سے بلند ہو کر دین کو اختیار کرتے ہیں۔

بیلٹ پر اپنے سامان کے انتظار میں کھڑے کھڑے میں نے سوچا کہ کتنی جلدی میں لاہور سے کراچی پہنچ گیا۔ اسی طرح دیکھتے ہی دیکھتے سب انسان دنیا سے آخرت میں پہنچ جائیں گے۔ اس روز اعلیٰ درجے کے جنتی جیسے ہی قبر سے اٹھیں گے فرشتے ان کے استقبال کے لیے آموجود ہوں گے۔ قدم قدم پر ان کی آؤ بھگت ہوگی۔ وہ بغیر کسی حساب کتاب کے جنت کے اعلیٰ ترین درجوں میں داخل ہو جائیں گے۔ اور ہمارے جیسے لوگ اپنے حساب کتاب کے انتظار میں کھڑے رہ جائیں گے۔

دنیا کی زندگی، اس کی فرسٹ کلاس، اس کے بنگلے، اس کی گاڑیاں، اس کے جلوے، اس کی عزت، اس کا مقام سب خواب ہو جائیں گے۔ میرے دل سے دعا نکلی کہ کاش اس دن کے آنے سے پہلے ہمیں اس چیز کی سمجھ آ جائے۔ وگرنہ موت کے وقت معلوم ہو جائے گا۔

وائے ناکامی کہ وقتِ مرگ یہ ثابت ہوا
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

شیعہ سنی جھگڑے کا حل

پاکستان میں ہونے والی دہشت گردی کی کئی جہتیں ہیں۔ ان میں سے ایک اہم جہت شیعہ سنی جھگڑے کے پس منظر میں ہونے والی قتل و غارت گری ہے۔ چنانچہ آئے دن اس حوالے سے کوئی نہ کوئی واردات ہوتی رہتی ہے اور عوام الناس کے ساتھ اہل علم بھی اس کا نشانہ بنتے رہتے ہیں۔ خاص کر محرم کے مہینے میں تو اس حوالے سے خوف و دہشت کی ایک فضا پیدا ہو جاتی ہے کہ نجانے اب کیا ہوگا۔ اس حوالے سے کیے جانے والے حفاظتی اقدامات کے نتیجے میں عملی طور پر بڑے شہروں کی زندگی معطل ہو جاتی ہے۔ برسہا برس گزر گئے ہیں لیکن اس صورتحال میں کوئی تبدیلی نہیں آ رہی بلکہ اب تو مڈل ایسٹ میں رونما ہونے والے واقعات کے حوالے سے یہ ایک بین االاقوامی نوعیت کا مسئلہ بنتا چلا جا رہا ہے۔ اب دنیا مشرق وسطیٰ کو فلسطین کے مسئلے کے حوالے سے کم اور اس حوالے سے زیادہ جاننے لگی ہے۔

اس صورتحال میں ہم سب کی یہ ذمہ داری ہے کہ اس مسئلے کے حل کے لیے سنجیدگی سے غور کیا جائے۔ میں نے اس حوالے سے کئی برس قبل ایک مضمون میں اس مسئلے کا ایک حل تجویز کیا تھا۔ میرے نزدیک اس مسئلے کا یہ واحد ممکنہ حل ہے۔ جب یہ مضمون شائع ہوا تو معروف شیعہ عالم علامہ ڈاکٹر محسن نقوی صاحب کو کچھ غلط فہمی لگی اور اس پر انھوں نے مجھے ایک ای میل لکھا۔ میں نے ایک خط میں اپنی بات کو مزید واضح کر کے بیان کر دیا۔ مجھے امید تھی کہ یہ معقول بات مان لی

جائے گی۔ یہ بات پرانی ہوگئی مگر پچھلے دنوں ڈاکٹر زبیر احمد صاحب جو کہ ٹی وی کے معروف اینکر ہیں، انھوں نے ایک ملاقات میں مجھے یہ بتایا کہ علامہ صاحب نے ملک کے ممتاز علماء کی ایک کانفرنس میں شیعہ سنی مسئلے کے حل کے لیے وہی تجویز پیش کی جو میں نے پیش کی تھی۔ ڈاکٹر زبیر صاحب نے مزید بتایا کہ اس پر ممتاز اہل حدیث عالم دین ابتسام الٰہی ظہیر نے یہ کہہ کر اس تجویز کی تائید کی کہ سب لوگ جانتے ہیں کہ میرے والد کون تھے (یعنی علامہ احسان الٰہی ظہیر جن کی زندگی کا بڑا حصہ اہل تشیع حضرات کے نقطہ نظر کے خلاف جدوجہد میں گزرا اور 1988 میں ایک جلسے میں خطاب کرتے ہوئے ایک بم دھماکے میں ان کی رحلت ہوئی) مگر اس کے باوجود میں اس تجویز کی تائید کرتا ہوں۔ بدقسمتی سے بعض دیگر اہل علم کی تائید نہ ہونے کی وجہ سے یہ معاملہ آگے نہ بڑھ سکا۔ تاہم اگر ایک بات معقول ہے تو اسے سامنے آنا چاہیے تاکہ اس مسئلے کے حل کی سمت کوئی قدم تو بڑھے۔ ورنہ یہ آگے نجانے کتنے گھر اور اجاڑے گا اور کتنے معصوم لوگ اور اہل علم اس کا نشانہ بنیں گے۔

میں اس تجویز کا خلاصہ پیش کر دیتا ہوں اور پھر اس کے بعد تفصیل کے لیے اپنا مضمون اور پھر علامہ محسن کو لکھا گیا اپنا ای میل بھی نقل کر دوں گا۔ میرا نقطہ نظر یہ ہے کہ اس حوالے سے بنائے فساد دو چیزیں بن رہی ہیں۔ ایک اہل تشیع حضرات کی طرف سے اور ایک اہل سنت کی طرف سے۔ اہل تشیع کی طرف سے صحابہ کرام پر کیا جانے والا سب وشتم جسے اصطلاحاً تبرا کہا جاتا ہے ایک خوفناک ردعمل کو جنم دیتا ہے۔ چنانچہ اہل تشیع علما کو یہ طے کرنا ہوگا کہ وہ اپنے نقطہ نظر کی اساس تبرّائی سوچ کے بجائے تولّائی سوچ پر رکھیں گے۔ یعنی صحابہ کرام سے نفرت کے بجائے اہل بیت کی محبت کی بنیاد پر اپنے لوگوں کی تربیت کریں۔

جبکہ دوسری طرف کے علما کو تکفیری سوچ کی حوصلہ شکنی کرنی ہوگی۔ اپنے لوگوں کو یہ بتانا ہوگا

کہ کسی کے عقیدے کی بنیاد پر اسے کافر قرار دے کر قتل کرنے کی اجازت کسی صورت میں نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا آزمائش کے اصول پر پیدا کی ہے اور لوگوں کو مکمل آزادی دی ہے کہ وہ جو چاہیں عقیدہ اختیار کریں۔ یہ اللہ کا ہی حق ہے کہ وہ چاہے تو کسی کو اس کے غلط عقیدے کی بنیاد پر سزا دے۔ یہ دروازہ ختم نبوت کے بعد بند ہو چکا ہے۔ اب یہ حق کسی صورت کسی انسان کو نہیں دیا جاسکتا کہ وہ کسی دوسرے فرد کے ایمان اور کفر کا فیصلہ کرے اور اس بنیاد پر قتل کردے۔ یہ بدترین ظلم اور سرکشی ہے۔

اسلام میں اگر کسی جرم پر سزائے موت دی گئی ہے تو اس کو نافذ کرنے کا حق بھی صرف اور صرف ریاست کے پاس ہے۔ عدالت میں باقاعدہ مقدمہ چلتا ہے۔ ملزم پر جرم ثابت کیا جاتا ہے۔ ملزم کو صفائی کا مکمل موقع دیا جاتا ہے۔ اسلام میں اس بات کا کوئی سوال ہی نہیں کہ خدائی فوجداروں کا کوئی گروہ کسی کے عقیدے کی بنیاد پر اس کے قتل کا فیصلہ کرلے اور اس کی جان مال آبرو کو کسی قسم کا کوئی نقصان پہنچائے۔

جب دونوں طرف سے یہ بات بار بار اپنے لوگوں کے سامنے رکھی جائے گی تو اختلاف ختم ہو نہ ہو فساد ضرور ختم ہو جائے گا۔ یہی اصل مطلوب ہے۔ رہا نقطہ نظر کا اختلاف تو علمی سطح پر یہ گفتگو جاری رہنی چاہیے۔ اصل فیصلہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ خود کردیں گے۔

اس تمہید کے بات میں وہ مضمون آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں جو میں نے 2007 میں لکھا تھا۔ یہ مضمون جو ''نئی امریکی سازش یا پرانا مسلم تنازعہ'' کے نام سے شائع ہوا تھا، درج ذیل ہے۔

نئی امریکی سازش یا پرانا مسلم تنازعہ

آج کل ہمارے ہاں ایک نئی امریکی سازش کا بڑا تذکرہ ہے۔ یہ سازش مشہور امریکی تھنک

ٹینک رینڈ کارپوریشن کے اس نظریے پر مبنی قرار دی جارہی ہے جس میں مشرق وسطیٰ کو سنی اور شیعہ بلاکوں میں تقسیم کرنے کا منصوبہ پیش کیا گیا تھا۔اس نظریے کے مطابق ایرانی قیادت میں عراق، بحرین، لبنان اور شام پر مشتمل ایک شیعہ بلاک ہونا چاہیے۔جبکہ اس کے بالمقابل سنی بلاک سعودی عرب کی قیادت میں وجود میں آئے گا۔

نظریہ سازش کے علمبرداروں کے نزدیک اس منصوبے پر عملدرآمد سے امریکہ اور اسرائیل کو متعدد فوائد حاصل ہوں گے۔ایک یہ کہ مسلم دنیا جو اسرائیل کی مخالفت میں یکسو تھی، آپس کے تنازعات میں الجھ جائے گی۔خاص کر عرب دنیا کی توجہ اپنے بدترین حریف اسرائیل کے بجائے ،ایٹم بم سے مسلح شیعہ خطرے کی طرف ہوجائے گی۔پھر اس خطرے کی بنا پر ایران کو ایٹم بم کے حصول سے روکنے کی جو کوششیں امریکہ اور مغربی مما لک کررہے ہیں، انہیں عرب اقوام کی بھرپور حمایت حاصل ہوجائے گی۔تیسرے اسلامی انتہا پسندوں کا رخ جو اس وقت امریکہ کی طرف ہے، وہ اس نئے تنازع کی طرف ہوجائے گا۔شیعہ انتہا پسند اور سنی انتہا پسند دونوں امریکہ اور اسرائیل کو چھوڑ کر آپس میں سر ٹکرانا شروع کردیں گے۔عراق میں جاری شیعہ سنی حملے پورے عالم اسلام کی جنگ بن جائیں گے۔خاص کر پاکستان میں جہاں شیعہ بڑی تعداد میں موجود ہیں، شیعہ سنی فسادات کی لہر اس طاقتور ملک کو کمزور کرنے میں بہت معاون ثابت ہوگی۔پھر یہ بات بھی لازمی ہے کہ ایران ان فسادات میں پاکستانی معاملات میں مداخلت کرے گا، اس لیے پاکستان سے اس کے تعلقات خراب ہوجائیں گے۔یوں ایران بیک وقت دو خطرات میں گھر جائے گا، جس کے ایک طرف عرب دنیا ہوگی اور دوسری طرف ایٹمی پاکستان۔چنانچہ اس کی توجہ اسرائیل سے ہٹ جائے گی۔ان تمام حالات میں امریکہ نہ صرف باعزت طور پر عراق سے نکل چکا ہوگا، بلکہ اسے مسلم انتہا پسندوں کے خطرے سے نجات مل جائے گی، جو آپس ہی میں لڑ مر کر

ختم ہوجائیں گے۔اسی طرح اسرائیل کو بھی عرب اور ایران خطرے سے نجات مل جائے گی اور اس کے مقابلے پر تنہا فلسطینی رہ جائیں گے۔جن پر اپنی مرضی کا کوئی بھی حل مسلط کیا جاسکتا ہے۔

رینڈ کارپوریشن کی اس تھیوری اور اس مبینہ سازش کے بارے میں کچھ دیر کے لیے فرض کرلیا جائے کہ یہ حقیقت پر مبنی ہے، تو اس بات کا اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ عالم اسلام کے لیے آنے والے دنوں میں کتنے سنگین مسائل پیدا ہونے والے ہیں۔تاہم غور کرنے کی بات یہ ہے کہ جس چیز کو ہم لوگ امریکی سازش قرار دے رہے ہیں کیا وہ واقعی کوئی امریکی سازش ہے یا ہماری اپنی ہی کوئی کمزوری ہے، جس نے صدیوں مسلمانوں کو نقصان پہنچایا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلمان ابتدا ہی سے شیعہ سنی تقسیم کے بہت سے نقصانات دیکھ چکے ہیں۔ موجودہ دور میں انتہا پسندی کے رجحانات نے اس تقسیم کی شدت کو مزید ہوا دی ہے۔خاص کر اختلافی نقطہ نظر رکھنے والوں کو کافر اور واجب القتل قرار دینے کی روش نے صورتحال کی سنگینی کو بہت زیادہ بڑھا دیا ہے۔پھر جدید ذرائع ابلاغ کی وجہ سے دوسرے نقطہ نظر کی محترم شخصیات کے بارے میں منفی نوعیت کی تقاریر اور تحریروں کا عام ہوجانا بھی معاملے کو سنگین بنادیتا ہے۔

ہمیں اگر کسی مبینہ 'امریکی سازش' کا توڑ کرنا ہے تو اس کا طریقہ یہ نہیں کہ ہم ہر جگہ امریکہ کو برا بھلا کہتے رہیں۔بلکہ اس کا طریقہ یہ ہے کہ ہم اپنی تعمیر کریں اور اپنی کمزوریوں کو دور کرنے کی کوشش کریں۔مثلاً شیعہ سنی اختلاف کے نقصانات سے بچنے کے لیے ہمیں یہودیوں اور مسیحیوں سے سبق لینا چاہیے۔دور جدید میں مسیحیت کے مختلف فرقوں اور ان سے بڑھ کر یہودیوں اور مسیحیوں نے اپنے اپنے اختلافات کو بڑی حد تک کم کردیا ہے۔حالانکہ ان کی تاریخ میں پیدا ہونے والے اختلافات کہیں زیادہ سنگین نوعیت کے تھے۔

مسیحی جس ہستی کو، معاذ اللہ، خدا کا بیٹا سمجھتے ہیں، یہودی اس ہستی کے قتل کی ذمہ داری قبول

کرتے رہے ہیں۔ان کے نزدیک وہ ہستی ایک جادوگر کی تھی۔مگر اب دونوں نے اپنا نقطہ نظر بدل لیا ہے۔یہودی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ایک معلم اور استاد کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔ جبکہ مسیحی لیڈر شپ یہودیوں کے بجائے، رومی حکومت کو اس عمل کا ذمہ دار ٹھہراتی ہے، جس نے (ان کے خیال کے مطابق) مسیح کو صلیب دی تھی۔

مسلمانوں کے لیے بھی اپنے اختلافات کو ختم کرنے کا راستہ یہ نہیں کہ شیعہ سنی اتحاد کی باتیں کی جائیں۔ بلکہ ضروری ہے کہ چند چیزیں مان لی جائیں۔ایک یہ کہ شیعہ سنی اختلافات کو بس ایک علمی بحث تک محدود رکھا جائے اور کفر و قتل کے فتوے دینے بند کر دینے چاہییں۔اس معاملے میں تمام لوگوں کی تربیت اس طرح کی جائے کہ تحمل اور رواداری کا جذبہ پیدا ہو۔دوسرے صحابہ کرام اور امہات المومنین کے بارے میں کوئی ایسی بات نہ کہی جائے جس سے لوگوں کے جذبات برانگیختہ ہوں۔اس معاملے میں شیعہ لیڈر شپ کی ذمہ داری بہت زیادہ ہے کیونکہ ان کی مذہبی قیادت نہ صرف بہت منظّم ہے بلکہ یہ مسئلہ بنیادی طور پر ان ہی کی طرف سے پیدا ہوتا ہے۔

اس لیے ضروری ہے کہ شیعہ حضرات میں سے وہ لوگ آگے بڑھیں جو تبرائی (صحابہ کرام کو برا بھلا کہنے کا طریقہ) کے بجائے تولائی (حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اور ان کے خاندان سے محبت کا طریقہ) فکر کے حامی ہوں۔اس طرز عمل کے نتیجے میں دونوں فرقوں کے اختلافات جذباتی کے بجائے علمی نوعیت کے رہ جائیں گے۔اور اس طرح اختلافات تو جب تک دنیا قائم ہے، باقی رہیں گے۔ان سے دلوں میں نفرت نہیں پیدا ہوگی۔

باقی جہاں تک امریکہ اور اس کی مبینہ سازشوں کا تعلق ہے تو یاد رکھنا چاہیے کہ دنیا میں ہر سپر پاور اپنے معاملات اسی اصول پر چلاتی ہے۔یعنی دوسروں کی کمزوری سے فائدہ اٹھانا۔یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم اپنی کمزوریوں کو دور کریں۔یہ امریکہ کی ذمہ داری نہیں ہے کہ وہ ہماری

کمزوریوں سے فائدہ نہ اٹھائے۔

میرا خط

میرے اس ای میل کے جواب میں علامہ محسن نقوی نے مجھے انگریزی میں ایک خط لکھا۔نجانے انھیں یہ غلط فہمی کیسے ہوگئی کہ میں نے اس مسئلے کی ساری ذمہ داری اہل تشیعہ پر ڈال دی۔اسی کی وضاحت میں میں نے ان کو درج ذیل خط لکھا تھا۔

میرے لیے یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ علامہ محسن نقوی جیسے عالم و فاضل شخص نے میرے مضمون پر اظہار کیا۔اپنے مضمون میں انہوں نے تفصیلی طور پر اپنا نقطہ نظر پیش فرمایا ہے۔مجھے مزید خوشی ہوتی اگر علامہ موصوف میری کسی بات پر نقد کرتے،مگر بدقسمتی سے انہوں نے میرے پورے مضمون کے جواب میں بمشکل ایک آدھ جملہ ہی لکھا ہے۔ظاہر ہے کہ جو کچھ میری تحریر کے حوالے سے انہوں نے لکھا ہے مجھ پر اس کا جواب دینے ہی کی ذمہ داری ہے اور وہی میں کرنے کی کوشش کروں گا۔ہوسکتا ہے کہ اس عمل میں میری بات مزید واضح ہو جائے۔لیکن اس سے قبل قارئین کی سہولت کے لیے میں وہ پیرا گراف نقل کر دیتا ہوں جس کا انہوں نے ترجمہ کیا ہے۔ میں نے عرض کیا تھا:

''مسلمانوں کے لیے بھی اپنے اختلافات کو ختم کرنے کا راستہ یہ نہیں کہ شیعہ سنی اتحاد کی باتیں کی جائیں۔ بلکہ ضروری ہے کہ چند چیزیں مان لی جائیں۔ایک یہ کہ شیعہ سنی اختلافات کو بس ایک علمی بحث تک محدود رکھا جائے اور کفر و قتل کے فتوے دینے بند کر دینے چاہییں۔اس معاملے میں تمام لوگوں کی تربیت اس طرح کی جائے کہ تحمل اور رواداری کا جذبہ پیدا ہو۔دوسرے صحابہ کرام اور امہات المومنین کے بارے میں کوئی ایسی بات نہ کہی جائے جس سے لوگوں کے جذبات برانگیختہ ہوں۔اس معاملے میں

شیعہ لیڈر شپ کی ذمہ داری بہت زیادہ ہے کیونکہ ان کی مذہبی قیادت نہ صرف بہت منظّم ہے بلکہ یہ مسئلہ بنیادی طور پر ان ہی کی طرف سے پیدا ہوتا ہے۔''

اس پیراگراف میں دو باتیں کہی گئی ہیں۔ پہلی یہ کہ قتل و تکفیر کے فتوے بند ہونے چاہییں۔ دوسرے یہ کہ صحابہ کرامؓ اور امہات المومنینؓ کے بارے میں منفی اندازِ گفتگو ختم ہونا چاہیے۔

اب دیکھیے کہ اس کے جواب میں علامہ موصوف کیا فرماتے ہیں:

"Obviously, the passage is written by a well-meaning Sunni. And the first thing he has done is BLAME THE OTHER SIDE."

اس کا ترجمہ یہ ہے کہ صاف ظاہر ہے کہ یہ بات ایک سنی کی طرف سے لکھی گئی ہے اور پہلا کام جو اس نے کیا وہ دوسرے پر الزام لگانا ہے۔ اس کے بعد علامہ نے پورا مضمون اس مفروضے پر لکھا ہے کہ میں نے اہل تشیع حضرات پر قتل و غارتگری کا الزام لگایا ہے اور اہل سنت کو اس سے بالکل بری قرار دیا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ حضرت علامہ نے یہ بات کہاں سے اخذ کر لی۔ میں نے ظاہر ہے کہ ایسی کوئی بات نہیں کہی۔ البتہ جو بات میں نے کہی ہے اور جس پر حضرت علامہ نے ایک لفظ نہیں لکھا وہ صحابہ کرامؓ اور امہات المومنینؓ کے بارے میں جذبات برانگیختہ کر دینے والی گفتگو ہے۔ مجھے بڑی خوشی ہوگی کہ اگر علامہ صاحب میری اس بات کی تردید کرتے ہوئے یہ فرمائیں کہ یہ سب تمھارا واہمہ ہے۔ شیعہ حضرات تو ان محترم ہستیوں سے بڑی عقیدت و محبت کا تعلق رکھتے ہیں۔

بہرحال ہر پڑھا لکھا بلکہ اب تو بغیر پڑھا لکھا شخص بھی جانتا ہے کہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس کی طرف میں نے توجہ دلائی تھی۔ میرے نزدیک اس مسئلے کو حل کیے بغیر شیعہ سنی اتحاد کی باتیں کرنا ایک ایسا خواب ہے جس کی تعبیر کبھی نہیں نکل سکتی اور نہ متشددانہ

تصادم کو روکا جا سکتا ہے۔ کیا شیعہ حضرات کسی ایسے گروہ کو معاف کر سکتے ہیں جو سیدنا علیؓ اور حضرت فاطمہؓ اور ان کی اولاد کے بارے میں گستاخانہ کلام کرے۔ پھر اپنے جیسے دوسرے انسانوں سے یہ توقع کیوں کی جاتی ہے۔ اسی پس منظر میں یہودی مسیحی مسئلے کے حل سے رہنمائی لینے کا فارمولا میں نے پیش کیا تھا۔

علامہ صاحب نے اپنے طور پر اس مسئلے کا جو حل پیش کیا ہے وہ ان کے الفاظ میں یہ ہے:

"The basic instrument for bringing peace and harmony in a divided community is FOR EACH SIDE TO UNDERSTAND THE POINT-OF-VIEW OF THE OTHER SIDE."

ایک تقسیم شدہ امت میں امن اور ہم آہنگی بحال کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ہر گروہ دوسرے گروہ کے نقطہ نظر کو سمجھے

یہ بات کہ ہر گروہ دوسرے گروہ کے نقطہ نظر کو سمجھے بڑی اہم ہے، مگر اس سے زیادہ اہم یہ ہے کہ اصل مسئلے کو سمجھا جائے۔ شیعہ سنی اختلاف کو فساد اور امت کی تباہی میں بدلنے والا عنصر عقیدہ اور نقطہ نظر کا اختلاف نہیں بلکہ بعض محترم ترین شخصیات کے خلاف اختیار کیا جانے والا لب و لہجہ ہے۔ اس کے بعد اب دونوں طرف کا نقطۂ نظر دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ طرز عمل صرف ایک طرف سے ظاہر ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ انھی کو کہا جائے کہ آپ کسی طرح اس چیز سے بچیں۔ اگر شیعہ حضرات یہ چھوڑ دیں تو پھر کسی کے لیے ممکن نہیں ہوگا کہ وہ جلتی پر پنکھا جھلے۔ اس لیے کہ یہ مسئلہ پنکھے کی ہوا سے نہیں بلکہ اس پٹرول سے پیدا ہوتا ہے جو صرف ایک فریق کے پاس ہے۔

ہو سکتا ہے کہ علامہ صاحب یہ فرمائیں کہ شیعہ حضرات کے پاس اپنے اس طرز عمل کا علمی اور تاریخی جواز ہے۔ ایسے میں ہم ان سے یہ دریافت کریں گے کہ کوئی گروہ اگر سیدنا علیؓ کے خلاف

کسی علمی اور تاریخی دلیل کی بنیاد پر یہ لب و لہجہ اختیار کر لے تو کیا وہ اس جواز کو سند قبولیت عطا فرما کر آنجنابؐ کی بارگاہ میں کسی گستاخی کو ایک لمحے کے لیے بھی قبول کر سکتے ہیں۔ اگر نہیں تو پھر وہ بتائیں کہ انہیں میرے دیے ہوئے حل کے سوا کون سا دوسرا قابل عمل حل نظر آتا ہے جس میں کسی شیعہ کو کافر قرار دینے یا مارنے کی بات نہیں کی جا رہی بلکہ اپنی بنیاد صحابہ کرامؓ کی نفرت کے بجائے آل فاطمہؓ کی محبت کی بنیاد پر استوار کرنے کا مشورہ دیا جا رہا ہے۔

امید ہے کہ حضرت علامہ میری معروضات پر ایک ''مسلمان'' بن کر غور فرمائیں گے۔ یہ آخری بات میں نے اس لیے کہی ہے کہ انہوں نے مجھے ایک well-meaning سنی قرار دیا ہے۔ میرے well-meaning ہونے (یعنی وہ شخص جو مسئلہ حل کرنے کی کوشش میں مسئلہ اور خراب کر دے) کا فیصلہ تو قارئین بہتر طور پر کر سکتے ہیں، البتہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک مسلمان امتی ہونے کے علاوہ اپنی کوئی اور شناخت نہ روزِ قیامت چاہتا ہوں نہ اس دنیا میں۔ اور اس حیثیت میں میرے سامنے صرف قرآن کی یہ آیت ہے۔

> اے ایمان والو! عدل کے علم بردار بنو، اللہ کے لیے اس کی شہادت دیتے ہوئے۔ اور کسی قوم کی دشمنی تمھیں اس بات پر نہ ابھارے کہ تم عدل نہ کرو۔ یہی تقویٰ سے قریب تر ہے۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ جو کچھ تم کرتے ہو بے شک اللہ اس سے باخبر ہے۔ (مائدہ8:5)

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہم سب کو ان اعمال کی توفیق دے جس سے ہم اس کی رضا حاصل کریں۔

والسلام

مقتل کے باسیوں کا اب حال کیا سنائیں

میری طبیعت اشعار کہنے کے لیے کبھی آمادہ نہیں ہوئی۔ زندگی میں شاید ایک آدھ شعر ہی کبھی کہا ہوگا۔ پچھلے دنوں بیرون ملک مقیم ایک عزیز دوست نے میری خیریت معلوم کی تو میں نے جواب دیا: 'ہماری کیا پوچھتے ہو، ہم تو ایک مقتل میں زندہ ہیں'۔ اپنے اردگرد پھیلے حالات کی مناسبت سے، جن کے لیے 'مقتل' سے زیادہ موضوع تعبیر ملنا مشکل ہے، چند اشعار موزوں ہو گئے ہیں۔ آج کی ملاقات میں بات انھی اشعار سے شروع کر رہا ہوں۔

مقتل کے باسیوں کا اب حال کیا سنائیں
خونی سمندروں کا ہم رنگ کیا بتائیں
قاتل بھی اپنے پیارے، مقتول بھی ہمارے
کس سے گلہ کریں ہم، کس کو لہو دکھائیں
ہر صبح ایک دہشت، ہر شام ایک وحشت
جب گھر ہی جل گیا ہو، تو آگ کیا بجھائیں
لیکن ہے حکمِ مالک مایوسیاں مٹانے
اس آگ سے ہی پر ہم اپنا دیا جلائیں

تاریکیوں کا کیا غم جب رب کا ہو سہارا
مایوسیوں میں آؤ روشن دیا جلائیں
روزِ جزا سے پہلے اُس زندگی سے پہلے
قہرِ خدا سے اپنی اِس قوم کو بچائیں
ریحاں کا ساتھ دے کر خوشبو کو عام کر دو
لوگوں میں جوت حق کی دن رات ہم جگائیں

ہم ہی قاتل ہم ہی مقتول

میں جس شہر اور جس ملک میں رہتا ہوں، انسانی جان جس طرح یہاں بے وقعت ہو چکی ہے، کم ہی کسی اور خطۂ ارضی میں ہوئی ہوگی۔ کراچی ہو یا بلوچستان، پنجاب ہو یا خیبر پختونخواہ کا علاقہ، ہر جگہ انسانی خون بے دردی سے بہایا جا رہا ہے۔ کہیں جرائم پیشہ افراد معمولی چیزوں کے پیچھے معصوموں کو قتل کر ڈالتے ہیں تو کہیں عوام الناس اور قانون کے رکھوالے ہی بے گناہوں کو سرِعام وحشیانہ تشدد کی بھینٹ چڑھا دیتے ہیں۔ کہیں بم دھماکے ہیں تو کہیں خود کش حملے، کہیں جلوسوں اور مزارات پر خون کی ندیاں بہائی جا رہی ہیں تو کہیں بازاروں میں تاجروں کو خون سے نہلایا جا رہا ہے۔ کہیں صلحا اور علما کو ٹارگٹ کلنگ کا نشانہ بنایا جا رہا ہے تو کہیں سیاسی اور گروہی مفادات کے کھیل میں عام لوگوں کو کیڑے مکوڑوں کی مانند مارا جا رہا ہے۔

یہ سب کچھ مسلمان کر رہے ہیں۔ کہیں انتقام کے نام پر تو کہیں اسلام کے نام پر۔ غلط بیانی کر رہے ہیں وہ لوگ جو کسی تیسرے ہاتھ یا باہر کی طاقت کو ان واقعات کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔ یہ اللہ کو بھی دھوکہ دینے کی کوشش کر رہے ہیں اور اہلِ ایمان کو بھی، مگر اپنے سوا یہ کسی اور کو دھوکہ نہیں دے رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تیسری طاقت اور بیرونی ہاتھ اگر کچھ کرنا بھی چاہیں تو محض

سرمایہ وغیرہ ہی فراہم کیا کرتے ہیں۔ خون کی ہولی تو اپنے ہی لوگ کھیل رہے ہیں۔ سارے باخبر لوگ جانتے ہیں کہ قاتل باہر سے نہیں آ رہے، یہ بھی اپنے مسلمان بھائی بند ہیں۔

کوئی اور تو نہیں ہے پسِ خنجر آزمائی
ہمیں قتل ہو رہے ہیں ہمیں قتل کر رہے ہیں

انسانی جان کی حرمت اور اسلام

ہمارے ہاں یہ سب کچھ ہو رہا ہے اور مجھے رہ رہ کر قرآن مجید اور حدیث کے وہ احکام یاد آ رہے ہیں جو معاشرے میں انسانی جان کی حرمت قائم رکھنے کے لیے دیے گئے ہیں۔ یقین نہیں آتا کہ یہ مسلمانوں کا معاشرہ ہے۔ یقین نہیں آتا کہ یہ اللہ رسول اور اسلام کا نام لینے والوں کا معاشرہ ہے۔ یقین نہیں آتا کہ یہاں ہر جمعہ میں کروڑوں مسلمان جمعہ کا خطبہ سنتے ہیں۔ مگر کیا کیجیے، اس معاشرے میں خطباتِ جمعہ کے موضوعات ہی کچھ اور ہوتے ہیں۔ انسانی جان کی حرمت یہاں کبھی زیرِ بحث نہیں آتی، بلکہ جو تقریریں ہوتی ہیں وہ بارہا نفرت کی ایسی آگ بھڑکاتی ہیں جو فرقہ وارانہ خون ریزی کا باعث بن جاتی ہیں۔

قرآن وحدیث میں انسانی جان کی حرمت اور اس کی اہمیت کے بارے میں اتنی تفصیل سے کلام کیا گیا ہے کہ اگر اس کو بیان کیا جائے تو ایک کتاب تیار ہو جائے گی۔ میں اجمالی طور پر چند باتیں پیش کر دیتا ہوں۔ دوسروں کو نہ سہی، مگر مذہب کا نام لے کر خون کی ہولی کھیلنے والوں اور در پردہ ان کی حمایت کرنے والوں کو شاید کچھ حیا آ جائے۔

قرآن مجید کے آغاز میں سورۂ بقرہ آیت 84 میں اللہ تعالیٰ نے یہ بات بیان کی ہے کہ انھوں نے بنی اسرائیل سے یہ عہد لیا تھا کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کا خون نہیں بہائیں گے۔ پھر بنی اسرائیل نے اس جرم عظیم کا ارتکاب کیا۔ اس پر قہرِ الٰہی بھڑکا اور یہ سزا سنائی گئی کہ اس

روپے کا بدلہ دنیا میں ذلت ورسوائی اور آخرت میں سخت ترین عذاب ہے۔

اسی سورۂ بقرہ آیت 173 میں جب اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو احکام شریعت دینا شروع کیے تو پہلا حرام یہ بیان ہوا کہ مردار وغیرہ کو نہ کھایا جائے، مگر انسانی جان اللہ کے نزدیک اتنی قیمتی ہے کہ بھوک سے جان پر بن آئے تو انھیں کھانے کی اجازت دے دی گئی۔ انسانی جان کے تحفظ کے لیے یہ رعایت قرآن مجید میں اور بھی کئی جگہ بیان ہوئی ہے۔ اگلا حکم جو ذرا آگے (آیت 178) میں دیا گیا وہ قصاص کا ہے۔ یعنی حکومتِ وقت مقتول کے قتل کے بدلے میں قاتل کو موت کی سزا دے گی۔ اس قصاص کو معاشرے کی زندگی کا ضامن قرار دیا گیا، (آیت 179)۔ کیونکہ جب ایک قاتل کو سزائے موت ملتی ہے تو کسی اور شخص کے لیے آسان نہیں رہتا کہ وہ دوسرے انسان کو قتل کرنے کی جرأت کرے۔ مگر اس میں بھی یہ رعایت دی گئی کہ مقتول کے ورثا معاف کر دیں تو قاتل کی جاں بخشی کر دی جائے۔ گویا انسانی جان کی اتنی وقعت ہے کہ اس طرح کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے اپنا ایک لازمی حکم واپس لے لیا۔

سورۂ مائدہ (32:5) میں ایک انسانی قتل کو کل انسانیت کے قتل کے برابر قرار دیا گیا اور ایک انسانی جان بچانے کو کل انسانیت کو بچانے کے مترادف قرار دیا گیا ہے۔ انسانی جان کی حرمت اور عظمت پر اس سے زیادہ بڑی بات کل مذہبی اور قانونی لٹریچر میں کہیں اور نہیں ملتی۔ پھر قتل مؤمن کو تو قرآن مجید نے ایک ایسا جرم قرار دیا ہے جس کی سزا پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''وہ شخص جو کسی مؤمن کو جان بوجھ کر قتل کر دے تو اس کی سزا جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔ اس پر اللہ کا غضب اور اس کی لعنت ہے اور اس کے لیے اللہ نے ایک بڑا عذاب تیار کر رکھا ہے۔''، (نساء 92:4)

اس آیت سے قبل ہی ایک تفصیلی ضابطہ اس ضمن میں بیان ہوا ہے کہ غلطی سے کسی مسلمان کا قتل ہو جائے تو اس کا کیا کفارہ ہے۔ حالانکہ قرآن مجید غلطی سے کیے گئے اعمال پر کوئی سزا مقرر نہیں کرتا، مگر ایک انسانی جان جانے پر انجانے پن اور غلطی کے باوجود بھی بھرپور سزا رکھی گئی ہے۔ یہ ہے انسانی جان کی اہمیت۔ جسے آج کے مسلمان اور ان کے نام نہاد رہنما مولی گاجر سے زیادہ وقعت دینے کو تیار نہیں۔

سورۂ نحل آیت 105 میں اللہ تعالیٰ اس حد تک گئے ہیں کہ جان بچانے کے لیے کلمۂ کفر کہنے تک کی اجازت دے دی ہے۔ ذرا سوچیے! انسانی جان کی حرمت کے ثبوت میں اس سے زیادہ بڑی اور کیا بات ہو سکتی ہے۔ پھر بنی اسرائیل کی طرح مسلمانوں کو بھی سورۂ نسا آیت 29 میں صراحت سے باہمی خونریزی سے روکا گیا ہے۔ سورۂ حجرات آیت 6 میں سخت تنبیہ ہے کہ غیر معتبر اور غیر مصدقہ اطلاع پر کسی گروہ کے خلاف کوئی اقدام نہ کیا جائے کہ مبادا معصوم انسانی جانوں کا زیاں ہو۔

پھر دیکھیے کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر ایک یکطرفہ معاہدۂ امن قبول کرنے میں کیا مصلحت بیان ہوئی ہے۔ سورۂ فتح آیت 25 میں اللہ تعالیٰ نے یہ واضح کیا ہے کہ صلح حدیبیہ کے وقت جنگ رکوانے میں اللہ تعالیٰ کی حکمت یہ تھی کہ مکہ میں نومسلم موجود تھے جن کے اسلام کا مدینہ کے مسلمانوں کو علم نہ تھا اور اندیشہ تھا کہ جنگ کی صورت میں لاعلمی کی وجہ سے یہ بھی مسلمانوں کے ہاتھوں مارے جاتے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اگر یہ نومسلم الگ ہوتے تو ہم ان کفار مکہ کو زبردست عذاب دیتے۔ گویا چند مسلمانوں کی جان بچانے کے لیے فتح مکہ کو مؤخر کر کے صحابہ کرام کو ایک ایسے معاہدے کو قبول کرنے پر مجبور کیا گیا جو بظاہر ایک شکست تھی۔ اللہ اکبر! اللہ تعالیٰ کی نظر میں انسانی جان کی کیا وقعت ہے اور اسلام کے نام لیواؤں کی نظر میں

یہ کتنی بے وقعت ہے۔

خودکشی کا معاملہ

یہ تو دوسروں کے قتل کا معاملہ تھا۔لیکن انسان کی اپنی جان تو بہرحال اس کی اپنی چیز سمجھی جاسکتی تھی۔مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ غلط فہمی بھی دور کردی۔انسانی جان کی حرمت اللہ اوراس کے رسول کے نزدیک اتنی زیادہ ہے کہ کسی انسان کو یہ حق تک حاصل نہیں کہ وہ اپنی جان خود لے۔چنانچہ خودکشی کے بارے میں رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

''جس نے اپنے آپ کو کسی لوہے سے قتل کیا تو وہ لوہا اس کے ہاتھ میں ہوگا کہ (بطور سزا) جہنم کی آگ میں اس سے اپنے پیٹ کو مارے اور وہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا اور جس نے اپنے آپ کو زہر پی کر قتل کیا تو وہ زہر اس کے ہاتھ میں ہوگا کہ (بطورِ سزا) جہنم کی آگ میں اس کے گھونٹ بھرے۔''، (مسلم، کتاب الایمان، باب: اپنے آپ کو قتل کرنے کی حرمت کا بیان)

ایک لمحے کے لیے اس روایت کو دوبارہ پڑھیے، خودکشی کے جرم کی سزا ابدی جہنم بیان ہوئی ہے۔قرآن وحدیث کے ان احکام کی بنا پر خودکشی کو کوئی جائز قرار نہیں دے سکتا، مگر بدقسمتی سے آج کے دور میں بعض نادان عرب علما نے خودکش حملوں کو 'استشہاد' یعنی طلب شہادت کا عمل قرار دے دیا ہے۔اس سخت وعید کے باوجود اس قسم کے فتوے کا ایک ہی سبب ہے۔وہ یہ کہ ایسے حملوں سے دشمنوں کو نقصان پہنچتا ہے۔مگر دین بتانے کا اگر یہی معیار ہے تو پھر ان نادان عربوں سے بعید نہیں کہ کچھ ہی عرصے میں وہ مسلمان بہن بیٹیوں کو یہ تلقین شروع کردیں کہ وہ دشمنوں کے راز معلوم کرنے اور ان کی صفوں میں داخل ہوکر انھیں نقصان پہنچانے کے لیے خوشی خوشی اپنا جسم انھیں پیش کردیا کریں۔پھر اسی بنیاد پر اس کے بارے میں بھی عالم عرب کے کسی

مفتی کا فتویٰ آجائے گا کہ یہ بدکاری اور زنا نہیں بلکہ طلب جنت کا 'مقدس' عمل ہے۔جس کے بعد جگہ جگہ مسلم خواتین کی بھرتی شروع ہوجائے گی اور انھیں ناز وانداز اور فحاشی کی تربیت اسلام کے مقدس نام پر دی جایا کرے گی۔جب ہمارے جیسے 'جاہل' قرآن وحدیث کی روشنی میں اس پر تنقید کریں گے تو عالم عرب وعجم کے سارے جذباتی مسلمان ایسے فتووں کی تائید اور ہماری مخالفت میں کھڑے ہوجائیں گے۔

پیغمبر انقلاب پیغمبر امن

قرآن مجید کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے رحمت للعالمین یعنی سارے جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔آپ جس دور میں تشریف لائے وہ مذہبی جبر یعنی (Religious Persecution) کا دور تھا۔یعنی اس دور میں اسلام قبول کرنے کا مطلب یہ تھا کہ مشرک لوگ مسلمانوں پر صرف ان کے ایمان کی وجہ سے بدترین ظلم وستم شروع کردیتے تھے۔اس صورتحال میں یہ ضروری تھا کہ جنگ کے ذریعے سے ان مشرکین کی کمر توڑ دی جائے تاکہ انسانیت کے ہر فرد کو بلا خوف وتردد یہ فیصلہ کرنے کا موقع مل جائے کہ وہ دلیل کی بنیاد پر دین حق کو قبول کرتا ہے یا نہیں۔اس پس منظر میں مسلمانوں کو اس ظلم کے خلاف جنگ وقتال کا حکم دیا گیا۔مگر جنگ کے احکام اس طرح دیے گئے کہ لڑائی میں کم سے کم جانی نقصان ہو۔مثلاً جب تک مدینہ میں مسلمانوں کی ریاست قائم نہیں ہوئی، انھیں تلوار اٹھانے کی اجازت نہ تھی۔حالانکہ مکہ میں مسلمانوں پر بدترین ظلم ہورہے تھے اور عمر، حمزہ، علی اور دیگر صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین اتنی تعداد میں موجود تھے کہ ظالموں کو مزہ چکھایا جاسکتا تھا۔مگر مکہ میں حبشہ اور مدینہ ہجرت کی اجازت تو دی گئی، جنگ کی اجازت کبھی نہیں دی گئی۔یہ اجازت صرف اس وقت ملی جب مدینہ میں مسلمانوں کا اقتدار قائم ہوگیا اور رسول اللہ ایک ریاست

کے سربراہ کی حیثیت سے مدینہ کے تاجدار بن گئے۔قتال کے لیے ریاست واقتدار کی یہ شرط اس لیے رکھی گئی ہے کہ ریاست تلوار اٹھانے والے افراد کے تمام اقدامات کی ذمہ دار ہوتی ہے اوراس کا ہر قدم پوری ریاست کے مفاد کو ذہن میں رکھ کر اٹھایا جاتا ہے نہ کہ بعض لوگوں کے احساسات وجذبات کے لحاظ میں۔اس اقتدار کے قائم ہونے کے بعد بھی ایک خاص تناسب کے بغیر جنگ فرض نہیں کی گئی، (انفال 66:8)۔ پھر خود نبی رحمت نے انسانی جان کے تحفظ کے لیے جو حکمت عملی مختلف مواقع پر اختیار کی؛ جس کی ایک مثال صلح حدیبیہ کی شکل میں اوپر بیان ہوئی ہے، اس کی بنا پر یہ عظیم اور ناقابل تصور واقعہ پیش آیا کہ پورا عرب مسلمان ہو گیا اور بمشکل ہزار آدمی مارے گئے۔جبکہ موجودہ زمانے کے انقلاب فرانس، انقلاب روس وغیرہ میں لاکھوں کروڑوں لوگ مارے گئے۔خدائے رحمٰن کے احکام اور نبی رحمت کا طریقہ یہ بتاتا ہے کہ ان کے نزدیک انسانی جان کتنی محترم تھی۔مگر آہ! آج ان کے نام لیواؤں کے نزدیک انسانی جان اور کیڑے مکوڑے میں کوئی فرق نہیں رہا۔

منافقین کے بارے میں نبی کریم کے اسوہ حسنہ کی رہنمائی

پاکستان میں قتل وغارتگری کی دیگر وجوہات پر اس مختصر ملاقات میں گفتگو ممکن نہیں کیونکہ اس کی کئی جہتیں ہیں۔ البتہ اس قتل وغارتگری کی ایک وجہ پر میں یہاں مختصراً گفتگو ضرور کرنا چاہوں گا۔ وہ ہے مذہبی وجوہات پر دوسروں کا قتل۔ ہمارے ہاں فکری اور نظری اختلاف کی بنیاد پر کسی کو بھی کافر قرار دے کر اس کے قتل کا فتویٰ جاری ہو جاتا ہے۔ یہ کام اسلام اور علم کے نام پر کھڑے بعض لوگ بے دریغ کرتے ہیں۔جس کے بعد روبوٹ جتنا عقل وفہم رکھنے والی قتل کرنے کی مشینیں قتل وغارتگری کا طوفان مچا دیتی ہیں۔ان انسان نما روبوٹوں کو تو خیر کیا سمجھایا جائے۔قتل کا فتویٰ دینے والوں اور ان کی حمایت کرنے والوں کو البتہ سمجھانے کی غرض سے نبی رحمت کا طریقہ

ہم ان کے سامنے رکھ دیتے ہیں۔شاید کسی کو توبہ کی توفیق نصیب ہو جائے۔

رسول اللہ کے دور میں عبداللہ ابن ابی اور دیگر منافقین کا ایک گروہ موجود تھا جو ہر طرح سے مسلمانوں کو نقصان پہنچانے، اذیت دینے اور تباہ کر دینے کی کوششوں میں برسہا برس مصروف رہا۔ یہ وہ دور تھا جب وحی نازل ہو رہی تھی۔رسول اللہ کو ان میں سے ہر منافق کے بارے میں نام بنام علم تھا۔بعض دفعہ ان منافقین کا فساد اتنا بڑھ گیا کہ صحابہ نے حضور سے درخواست کی کہ ان لوگوں کے قتل کا حکم جاری کر دیا جائے۔مگر خدائے رحمٰن اور نبی رحمت کا طریقہ دیکھیے۔اس کی کبھی اجازت نہ دی گئی۔اس کی وجہ کیا تھی؟ وجہ صرف یہ تھی کہ یہ لوگ اپنے آپ کو ظاہر میں مسلمان کہتے تھے۔حقیقت یہ تھی کہ یہ لوگ اپنے دعوائے ایمان میں بالکل جھوٹے تھے جن کے جھوٹ کی قلعی قرآن مجید نے بار بار کھولی ہے۔اس کے باوجود ایک اصول قائم کرنے کی خاطر ان کو قتل نہیں کیا گیا۔ وہ اصول یہ ہے کہ جب تک کوئی شخص خود کو مسلمان کہہ رہا ہو اور اس نے ان دیگر حدود کو پامال نہ کیا ہو جن کی سزا شریعت میں موت مقرر کی گئی ہے جیسے قصاص وغیرہ، محض منافقت اور دشمنوں کا ایجنٹ ہونے کا الزام لگا کر اس کو قتل کرنا کسی صورت جائز نہیں۔ یہ وہ اصول ہے جو اللہ اور اس کے رسول نے خود قائم کیا ہے۔اگر کسی کو محسوس ہوتا ہے کہ کوئی فرد یا گروہ گمراہی کا شکار ہے تو وہ یقیناً ان کی غلطی کو واضح کرے، مگر ان کے قتل کا فتویٰ دینا، اس کی حمایت کرنا، یا ان کو قتل کر دینا، یہ سب دراصل اللہ اور اس کے رسول کے طریقے کو چھوڑ کر ابلیس کے اس طریقے کی پیروی کرنے کے مترادف ہے جو سرتاسر سرکشی کا طریقہ ہے۔

حضرت اسامہ کا واقعہ

اس ضمن میں کتب احادیث میں بعض واقعات بیان ہوئے ہیں جو انسانی جان کی اس حرمت اور تحفظ کا نہ صرف کھلا بیان ہیں جو ایک شخص کو قانونی طور پر ایمان لانے کے بعد

حاصل ہو جاتا ہے بلکہ اس میں اس غضب کا بھی بیان ہے جو اس اصول کی خلاف ورزی پر رحمت للعالمین نے ظاہر فرمایا۔ ہم صحیح بخاری و مسلم میں نقل ہونے والا ایک واقعہ نقل کر رہے ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ بولے بیٹے حضرت زید کے صاحبزادے حضرت اسامہ کا ہے۔ حضرت زید اور ان کے بیٹے اسامہ حضور کو کتنے محبوب تھے یہ بات سیرت نبوی سے ادنیٰ واقفیت رکھنے والے بھی اچھی طرح جانتے ہیں، مگر پھر بھی اس واقعے میں حضور کا ردعمل ملاحظہ فرمائیے:

''سیدنا اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں ایک سریہ میں بھیجا۔ (......دوران جنگ) میں نے ایک شخص کو پایا، اس نے لا الٰہ الا اللہ کہا۔ میں نے برچھی سے اس کو مار دیا۔ اس کے بعد میرے دل میں وہم ہوا (کہ لا الٰہ الا اللہ کہنے پر مارنا درست نہ تھا) میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا اس نے لا الٰہ الا اللہ کہا تھا اور تو نے اس کو مار ڈالا؟ میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اس نے ہتھیار سے ڈر کر کہا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تو نے اس کا دل چیر کر دیکھا تھا تا کہ تجھے معلوم ہوتا کہ اس کے دل نے یہ کلمہ کہا تھا یا نہیں؟ (مطلب یہ ہے کہ دل کا حال تجھے کہاں سے معلوم ہوا؟) پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم بار بار یہی فرماتے رہے یہاں تک کہ میں نے آرزو کی کہ کاش میں اسی دن مسلمان ہوا ہوتا (تو اسلام لانے کے بعد ایسے گناہ میں مبتلا نہ ہوتا کیونکہ اسلام لانے سے پچھلے گناہ معاف ہو جاتے ہیں)۔''

اس واقعے سے متعلق دیگر روایات کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کافر نے کئی مسلمانوں کو قتل کیا تھا اور قرائن سے واضح تھا کہ اس کافر نے حضرت اسامہ کی زد میں آ جانے کے

بعد صرف موت کے خوف سے کلمہ پڑھا تھا۔ مگر پھر بھی آپ نے دیکھ لیا کہ اللہ کے رسول کا ردعمل کیا تھا۔ بلکہ ایک دوسری روایت میں جو سب سے سنگین پہلو بیان ہوا ہے وہ یہ ہے کہ جب حضرت اسامہ نے حضور سے درخواست کی کہ آپ ان کی بخشش کی دعا کیجیے تو حضور دعا کرنے کے بجائے بار بار یہی کہتے رہے کہ ''تم کیا جواب دو گے لا الٰہ الا اللہ کا جب وہ قیامت کے دن آئے گا؟''۔ یہ ہے اللہ اور رسول کے نزدیک انسانی جان کی حرمت۔ اب جس کو اللہ اور اس کے رسول سے محبت ہے اس پر فرض ہے کہ وہ انھی کے طریقے کو اختیار کرتے ہوئے انسانی جان اور خاص کر مسلمان کی جان، چاہے وہ مسلمان اس کی نظر میں منافق اور کافر ہی کیوں نہ ہو، کی حرمت کا پاس کرے۔ وگرنہ قیامت کے دن ایسے لوگ خدا کے حضور قاتلوں کے روپ میں پیش ہوں گے اور قاتلوں ہی کے انجام کو پہنچیں گے۔

مسلمان کی جان کی حرمت کے حوالے سے چند احادیث

یہ تو ایک واقعہ تھا، مگر انسانی اور خاص کر ایک مسلمان کی جان کی حرمت کے ضمن میں سرکار دوعالم رحمت للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے متعدد ارشادات ایسے ہیں جو آج ہر مسلمان اور خاص کر اسلام کا نام لے کر معصوم مسلمانوں کی قتل و غارتگری کا بازار گرم کرنے والوں اور ان کی در پردہ حمایت اور فکری پشت پناہی کرنے والوں کو سنانا شاید دین کی سب سے بڑی خدمت ہے۔ اس ضمن میں چند ارشاداتِ نبوی جو صحیح بخاری سے لیے گئے ہیں، درج ذیل ہیں:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا:

''تمہارے (مسلمانوں) کے خون، اموال اور عزتیں ایک دوسرے پر حرام ہیں، اس دن (عرفہ)، اس شہر (ذوالحجہ) اور اس شہر (مکہ) کی حرمت کی مانند۔ کیا میں نے تم تک بات پہنچا دی؟ صحابہ نے (بیک آواز) عرض کیا: جی ہاں۔''

اسی موقع پر آپ نے مزید ارشاد فرمایا:

''دیکھو! میرے بعد دوبارہ کافر نہ بن جانا کہ آپس میں ایک دوسرے کی گردنیں مارتے پھرو۔''

''مسلمان کو گالی دینا فسق ہے اور اس سے قتال کرنا کفر ہے۔''

''جس نے ہم (مسلمانوں) پر ہتھیار اٹھایا وہ ہم میں سے نہیں۔''

''تم میں سے کوئی اپنے بھائی کی طرف ہتھیار سے اشارہ نہ کرے۔ اسے کیا معلوم کہ شاید شیطان اس کے ہاتھ سے اسے (ہتھیار کو) گرادے (یا چلادے) تو (مسلمانوں کو قتل کرنے کی وجہ سے) وہ جہنم کے ایک گڑھے میں جا گرے۔''

''جب دو مسلمان اپنی تلواریں لے کر ایک دوسرے سے لڑ پڑیں تو وہ دونوں جہنم میں جائیں گے۔ صحابہ نے دریافت کیا کہ اے اللہ کے رسول! ایک تو قاتل ہے (اس لیے جہنم میں جائے گا) لیکن مقتول کا کیا قصور؟ فرمایا: اس لیے کہ اس نے اپنے (مسلمان) ساتھی کے قتل کا ارادہ کیا تھا۔''

پس نوشت

میں اس مضمون پر نظر ثانی سے فارغ ہوا ہی تھا کہ درۂ آدم خیل میں نماز جمعہ اور پشاور میں نماز عشا میں خودکش حملوں میں 100 سے زائد نمازیوں کی شہادت کے المناک واقعات پیش آئے۔ ہم کمزور و عاجز لوگ اور اس مقتل کے باسی اپنے ان معصوم اور بے گناہ بھائیوں کا مقدمہ اپنے پروردگار کے حضور پیش کرتے ہیں جنھیں خدا کے نام پر کھڑے لوگوں نے خدا کی عبادت کرتے وقت پورے شعور اور ارادے کے ساتھ مارا۔ ہم اس مقدمے میں صرف قاتلوں کو نہیں بلکہ اسلام کے نام پر کھڑے ان تمام صحافیوں، مذہبی سیاسی جماعتوں کے امرا اور خود کو علما

اور اہل حق کہلوانے کے شوقین لوگوں کو بھی نامزد کرتے ہیں جن کے فتووں، تاویلوں اور در پردہ حمایت نے آج مسجدوں کو مقتل میں بدل دیا ہے۔ وہ دن دور نہیں جب تمام مقتولوں کو زندہ کیا جائے گا۔ وہ اذان و اقامت کہتے اور کلمہ پڑھتے ہوئے اللہ تعالی کے حضور پیش ہوں گے۔ قاتلوں اور ان کے حمایتیوں کو بھی اللہ تعالیٰ کی عدالت میں پیش کیا جائے گا۔ ان بے گناہ کلمہ گو مسلمانوں کا مقدمہ خود آقائے دوجہاں حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پیش کریں گے۔ پروردگار عالم قاتلوں اور ان کے حمایتیوں سے تو کوئی سوال نہیں کرے گا، البتہ معصوم و بے گناہ نمازیوں کو مخاطب کرکے ان سے ضرور پوچھا جائے گا کہ تمھیں کس جرم میں مارا گیا تھا؟

اس روز سب سے زیادہ بدنصیب وہ سفاک قاتل نہیں ہوگا جس نے خدا کے آگے سربسجود ہونے والوں کو ان کی لاعلمی میں خودکش حملوں کا نشانہ بنایا ہوگا، اس لیے کہ اسے تو صرف ان مقتولوں کا حساب دینا ہوگا جن کو اس نے قتل کیا تھا۔ اس روز اصل بدنصیب تو ان کے وہ حمایتی ہوں گے جن کو خودکش حملے میں ہلاک ہونے والے ہر ہر مقتول کے مقدمے کے موقع پر بلایا جائے گا کیونکہ انھی کے فتووں، تاویلوں، پردہ پوشی اور خاموش حمایت نے ان مظلوموں کے قتل کی راہ ہموار کی تھی۔ پھر قتل کے ہر جرم کا ایک حصہ ان کے نامۂ اعمال میں ڈال دیا جائے گا۔ یہ وہ دن ہوگا جب ان کی کوئی تاویل اور ان کی کوئی چالاکی ان کے کام نہ آئے گی۔ فلیضحکوا قلیلا ولیبکوا کثیرا۔

باقی رہے اس مقتل کے باسی تو وہ ہر ظالم اور ہر قاتل کے مقابلے میں صرف اپنے پروردگار کی پناہ چاہتے ہیں۔ اللھم انا نجعلك في نحورھم و نعوذبك من شرورھم ۔ اے اللہ! ہم ان کے مقابلے میں تجھ کو لاتے ہیں اور ان کے شر سے تیری پناہ مانگتے ہیں، (صحیح الجامع 4706)۔

ارتقااور خارجی رہنمائی

فکر جدید کا المیہ

پچھلی کئی صدیوں سے دنیا پر اقوام مغرب دنیا میں امامت اور غلبے کے مقام پر فائز ہیں۔ مغرب کے اس عروج کا آغاز اس علمی وفکری انقلاب سے ہوا تھا جسے احیائے علوم (Renaissance) اور روشن خیالی (Enlightenment) کی تحریکوں کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ان تحریکوں کے جہاں اور بہت سے اثرات ہوئے وہیں ایک نتیجہ یہ نکلا کہ خدا فکر انسانی کا مرکزی خیال نہیں رہا۔ اس سے آگے بڑھ کر آنے والے زمانے میں وجود باری تعالیٰ ہی کا انکار کر دیا گیا۔ انکار خدا کی یہ فکر اہل علم و دانش کی حد تک آج بھی ایک مسلمہ فکر کے طور پر مانی جاتی ہے۔

انکار خدا کی اس فکر کو علمی اساس ڈارون (1882- 1809) Charles Robert Darwin کے نظریہ ارتقا (Theory of Evolution) نے مہیا کی تھی۔ اس نے انیسویں صدی کے آخر میں اپنی مشہور کتاب Origin of Species میں یہ نقطہ نظر پیش کیا کہ زندگی کے وجود اور بقا کی ایک ممکنہ سائنسی توجیہ یہ ہے کہ حیات کا آغاز بہت ابتدائی اور سادہ سطح سے ہوا اور بتدریج ارتقائی عمل سے گذر کر زندگی کی زیادہ پیچیدہ اقسام اور انسان جیسی مخلوق تک آن پہنچا ہو۔

ڈارون کے بعد بیسویں صدی کی جدید سائنسی ترقی نے بہت سے ایسے سوالات اٹھا

دیے ہیں جنہوں نے ارتقا کے نظریے کی بنیاد ہلا کر رکھ دی ہے۔ مگر بدقسمتی سے جدید دنیا اور اہل علم و دانش ارتقا کو رد کر کے خدا کے وجود کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نظریہ ارتقا کو رد کرنے کے بعد انسانی وجود کی توجیہ کے طور پر اگر وہ خدا کو مانیں گے تو پھر متبادل کے طور پر ان کے سامنے وہی روایتی مذاہب باقی رہ جاتے ہیں جن کو وہ پہلے ہی رد کر چکے ہیں۔ انسانی تاریخ اور فکر انسانی عرصہ پہلے ہندومت کی بت پرستی، مسیحیت کی انسان پرستی اور یہودیت کی نسل پرستی کو مسترد کر چکی ہے اسے درست تسلیم کرنا پڑ جائے گا۔ ظاہر ہے کہ مذہب کی یہ تعبیرات کوئی معقول انسان قبول نہیں کر سکتا۔ چاہے اس کے لیے انہیں ارتقا جیسے غیر معقول نظریے کو قبول کرنا پڑے۔

فکر جدید کا یہ عجیب المیہ ہے اور اس پر جتنا ماتم کیا جائے اتنا ہی کم ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس المیے کو جنم دینے میں مسلمانوں کا بہت بڑا کردار ہے، جن کے پاس قرآن مجید کی شکل میں وہ آخری الہامی سچائی ہے جو ہر قسم کے انسانی انحرافات سے محفوظ ہے۔ مگر بدقسمتی سے مسلمانوں کو اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ وہ اللہ اور انسانیت کے درمیان رابطے کا کردار ادا کرنے والی ''امت وسط'' کے بجائے ایک قوم کا کردار پسند کر چکے ہیں اور قومی مفاد، خواہشات اور تعصّبات سے بلند ہونے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

نظریہ ارتقا کے حامیوں کی کمزوری

خیر سر دست یہ ہمارا موضوع نہیں ہے۔ ہمارا اصل موضوع نظریہ ارتقا اور اس کے حامیوں کے انداز فکر کی بنیادی کمزوری کو سامنے لانا ہے۔ ہمارے نزدیک موجودہ دور میں ارتقا کے نظریے کے حامیوں کے انداز فکر کی بنیادی کمزوری یہ ہے کہ اسے حقائق تک پہنچنے کا ایک ذریعہ سمجھنے کے بجائے انہوں نے اسے ایک عقیدہ (dogma) بنا دیا ہے۔ اس کے

ماننے والے تمام سائنسی حقائق کو نظر انداز کر کے اسے خدا کے عقیدے کو نہ ماننے کے لیے ایک متبادل عقیدے کے طور پر اختیار کرتے ہیں۔اس ''عقیدے'' کے خلاف جتنی بڑی حقیقت بھی سامنے آجائے اس کے ''پیروکار'' اپنے کٹر پن میں انتہائی بے معنی گفتگو کرتے رہتے ہیں۔ وہ ایک لمحے کے لیے بھی رک کر یہ سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کرتے کہ معترض نے کس طرح ان کے اس ''عقیدے'' کے قدموں تلے سے سائنس کی زمین کھینچ لی ہے۔

Evolution with Direction

نظریہ ارتقا کے دو پہلو ہیں۔ ایک وہ ارتقا جو معلوم مشاہدات پر مبنی ہے۔ دوسرا وہ جو محض ظن وتخمین اور اندازوں پر مشتمل ہے۔ پہلی قسم کا ارتقا تو کائنات کی ایک ناقابل تردید حقیقت ہے۔ یہ کائنات کا ایک مسلمہ قانون ہے جس سے کسی شے کو استثنا حاصل نہیں۔ زمین کا ایک گیس کے ایک گرم گولے سے لے کر جنت ارضی میں تبدیل ہونے کا عمل ہو یا پھر انسان کا شکم مادر میں ایک قطرہ آب سے ایک مکمل انسان بننے کا معاملہ ہو، ہر تخلیقی عمل ارتقا کی منازل طے کر کے ہی اپنی منزل مقصود تک پہنچتا ہے۔ خاص کر بچے کا ایک ابتدائی خلیے (Zygote) سے مکمل انسان بننے کا معاملہ تو ایک روزمرہ کا مشاہدہ ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ اس کا وجود اس دنیا میں ایک دن اور ایک لمحے میں نہیں آیا بلکہ درجہ بدرجہ شکم مادر میں مختلف مراحل طے کر کے انسان اس دنیا میں آتا ہے۔

ارتقا کی یہ قسم جو مشاہدے پر مبنی ہے، اس میں ایک حقیقت بالکل نمایاں ہے۔ وہ یہ کہ یہ ارتقا ایک خاص سمت میں ہوتا ہے۔ اس کی منزل متعین ہوتی ہے۔ اس منزل کی سمت بڑھنے کا ہر مرحلہ اور ہر موڑ طے ہوتا ہے۔ اس منزل کا پورا نقشہ Genome میں موجود ہوتا ہے۔ جینوم DNA کا مجموعہ ہوتا ہے جو زندگی کے ہر پہلو سے متعلق مکمل معلومات اور ہدایات کا

ایک مجموعہ ہوتا ہے جو زندہ جسم کے ہر ہر خلیہ کے مرکز میں موجود ہوتا ہے۔ یہ گویا کہ ایک کمپیوٹر پروگرام ہے جو طے کرتا ہے کہ کس مرحلے پر کیا ہوگا۔

عظیم معجزہ

انسانوں میں یہ جینوم تین ارب DNA کے جوڑوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ یہ جینوم کوئی الل ٹپ تحریر نہیں بلکہ ایک مکمل منصوبہ اور مرطوب نقشہ ہوتا ہے جو انتہائی بامعنی انداز میں کام کر کے ایک انتہائی بامعنی مخلوق یعنی انسان کو جنم دیتا ہے۔ ماں کے پیٹ میں ایک خلیے (Zygote) سے سفر شروع کرنے والا ایک وجود جب مکمل بچے کی شکل میں جنم لیتا ہے تو وہ 5 کھرب خلیوں ہی میں تبدیل نہیں ہو چکا ہوتا بلکہ سر، دل، دماغ، ہاتھ پاؤں غرض ہر ممکنہ ضروری چیز لے کر اس دنیا میں آتا ہے۔ مگر ایک خلیے سے پانچ کھرب خلیوں کا یہ سفر جینوم کی ہدایات کے عین مطابق ہوتا ہے۔ یہ بظاہر ارتقا ہے، لیکن اس کے پس منظر میں ایک منصوبہ ساز ہستی کا مکمل منصوبہ موجود ہوتا ہے جو تخلیقی عمل کے ہر موڑ پر اس ارتقا کو درست سمت دے رہا ہوتا ہے۔

رہنمائی کا یہ عمل اس کے بعد بھی جاری رہتا ہے جس کو ہم اپنی آنکھوں سے روزمرہ میں دیکھتے ہیں۔ یہ رہنمائی بیک وقت ایک سے زیادہ جگہ ہو رہی ہوتی جو صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب کوئی خارجی قوت جو ہر چیز کا مکمل شعور رکھتی ہو، اس پورے معاملے کو کنٹرول کر رہی ہو۔ مثلاً پیدا ہونے والا بچہ اس قابل نہیں ہوتا کہ فوری طور پر وہ عام انسانی غذا لے سکے۔ چنانچہ معجزانہ طور پر اس کی پیدا کرنے والی ماں کا اپنا وجود اس کی خوراک کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ ماں کے وجود سے نہ صرف یہ کہ اسے دودھ کی خوراک ملتی ہے بلکہ حیرت انگیز طور پر یہ خوراک اس بچے کی تمام ضروریات پوری کرنے کے لیے کافی ہوتی ہے اور آج کے دن تک ماں کے دودھ سے بہتر خوراک نہیں دریافت کی جا سکی۔

یہ صرف ایک مثال ہے، وگرنہ یہ کائنات اوراس کے تمام اجزااس چھوٹے سے بچے اور دیگر تمام اقسام کی حیات برقرار رکھنے کے لیے انتہا سے زیادہ باہم موافق ہیں۔مثلاً زمین کا سورج سے فاصلہ جوایک خاص درجہ حرارت برقرار رکھنے کے لیے لازمی ہے،فضا میں گیسوں کا ایک خاص تناسب، زمین پر پانی کی موجودگی اوران جیسی لاکھوں چیزیں جو بلا واسطہ اور بالواسطہ زندگی کی بقا کے لیے لازمی ہیں۔ان سب کی ایک جگہ پرموجودگی یہ واضح کرتی ہے یہ یہ بخت واتفاق کی کارفرمائی نہیں بلکہ ایک باشعور ہستی کی قدرت اورارادے کا نتیجہ ہے۔

ارتقا بطور ایک عقیدہ اور خدا کا بدل سمجھنے والے نادان یہ کہتے ہیں کہ ایک طویل عرصے کے ارتقائی عمل کے نتیجے میں یہ سب کچھ اتفاق سے پیدا ہوگیا۔کائنات میں زمین جیسے حیات دوست سیارے سے لے کر جینوم اورڈی این اے جیسی پیچیدہ چیزیں مخلوقات میں خودبخود پیدا ہوگئی ہیں۔مگر یہاں بھی خود سائنس ہی بتا دیتی ہے کہ ایں خیال است ومحال است وجنوں۔ اس حقیقت کو جاننے کے لیے ہم صرف انسانی جینوم کی مثال کوسامنے رکھتے ہیں۔جیسا اوپر بیان ہوا ہے کہ انسانوں میں یہ جینوم تین ارب DNA کے جوڑوں پر مشتمل ہوتا ہے۔تخمینہ لگایا گیا ہے کہ ایک انسان اگر 50 برس روزانہ بلاناغہ 8 گھنٹے مسلسل 60 الفاظ کی منٹ کی رفتار سے ٹائپنگ کرتا رہے تب کہیں جا کر ایک انسانی جینوم تحریر کیا جاسکے گا۔اس مثال سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ کس درجہ کی تفصیلات اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔یہاں یہ خیال رہے کہ دنیا میں بامعنی حیات کا معاملہ ہو،انسانی ہاتھوں سے لکھی ہوئی کوئی تحریر ہو یا پھر انسانی جینوم ہو ہر چیز میں معنویت اورزندگی صرف اس وقت پیدا ہوتی ہے جب وہ ایک خاص طریقے سے مرتب ہو۔اب آیئے اورایک مثال کے ذریعے سے یہ سمجھیے کہ اس بات کے کتنے امکانات ہیں کہ اس جیسی کوئی بامعنی اورمفصل تحریر محض اتفاق سے لکھی جاسکتی ہے۔

ریاضیاتی ثبوت

ریاضی کا ایک ابتدائی طالب علم بھی یہ جانتا ہے کہ Permutation کے ذریعے سے یہ معلوم کیا جاسکتا ہے کہ ایک مجموعے کے اجزا کو کتنے ممکنہ طریقوں سے مرتب کیا جاسکتا ہے۔مثلاً انگریزی زبان میں 26 حروف ہوتے ہیں۔انگریزی میں لکھا گیا کوئی بھی لفظ انہیں سے مرتب کیا جاتا ہے۔Permutation کے فارمولے کی وضاحت کے بجائے میں فارمولے سے نکلنے والے نتائج سے بات سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں۔انگریزی حروف تہجی کے 26 اجزا میں سے اگر ایک حرف پر مشتمل لفظ لکھنا ہے تو اس کے 26 ممکنہ طریقے ہیں۔دو حرفی لفظ کے لیے 650، تین کے لیے 15600، چار کے لیے 358800 اور پانچ حرفی لفظ کے لیے 7893600 ممکنہ طریقے استعمال کیے جاسکتے ہیں۔اس کا مطلب یہ ہے کہ Allah کا پانچ حرفی لفظ اگر میں یا آپ لکھیں گے تو ایک سیکنڈ اور ایک ہی کوشش میں لکھ ڈالیں گے۔مگر یہ کام اگر بخت واتفاق کے ہاتھ میں چھوڑ دیا جائے تو پھر 78 لاکھ 93 ہزار 6 سو الفاظ لکھنے کے بعد ہی اس بات کا یقین کیا جاسکتا ہے کہ ان میں سے ایک لفظ Allah ہوگا۔

یہ صرف ایک لفظ کا معاملہ ہے۔اب سوچیے کہ تین ارب بامعنی ہدایات جو ایک خاص طریقے پر مرتب ہوں ان کو اس ترتیب شدہ شکل میں لانے کے لیے اتنا وقت چاہیے کہ کھربوں برس کو کھربوں سے ضرب دے کر بھی کوئی لفظ اس وقت کو بیان نہیں کرسکتا۔جب کہ ہم جانتے ہیں کہ ہماری کائنات کوئی ابدی نہیں کہ وقت کی لامحدود مدت میں مادہ اس قسم کے تجربات کر کے بخت واتفاق کے بطن سے بامعنی جینوم کو جنم دے دے۔معلوم ہے کہ اس دھرتی کی عمر چار ارب سال سے زائد نہیں۔سائنسی طور پر یہ ممکن ہی نہیں کہ چار ارب سال میں یہ اتفاق ہوسکے۔

یہ سب صرف اس وقت وجود میں آ سکتا ہے جب ایک خالق تخلیق کے عمل سے ہر چیز کا آغاز کرے اور اپنی رہنمائی میں درجہ بدرجہ اسے اپنے کمال تک پہنچائے۔ اس دنیا میں زندگی سادہ شکل سے شروع ہوکر ایک انتہائی پیچیدہ شکل تک جس راستے پر چل کر پہنچتی ہے وہاں ہزاروں موڑ ایسے آتے ہیں جس میں سے ہر موڑ تخلیق کو اپنی منزل اور موجودہ شکل سے بہت دور کرسکتا تھا۔مگر ہر جگہ فطرت درست موڑ لیتی ہے۔اور آخر کار وہی چیز وجود میں آتی ہے جو انتہائی بامعنی بھی ہے اور اپنے اردگرد کی کائنات کے لیے مفید بھی۔اس دنیا کی ہر چیز اس قدر پیچیدہ اور حیران کن ہے کہ یا تو انسان اسے کسی برتر خالق کے ارادے کا اظہار مان لے۔ وگرنہ دوسری شکل صرف یہی ہے کہ انسان اللہ یا خدا کا نام لینے کے بجائے نیچر اور فطرت کا نام لے کر ان کے ذمے وہ سارے کام ڈال دے جو اللہ تعالیٰ کر رہے ہیں۔

ظاہر ہے اس بے وقوفی پر کیا تبصرہ کیا جاسکتا ہے۔کوئی معقول آدمی ایک لمحے کو یہ بات نہیں مان سکتا اس قدر پیچیدہ مگر بامعنی اور باشعور زندگی اور اس زندگی کو برقرار رکھنے کے ایسے غیر معمولی انتظامات اندھے بہرے مادے اور بے مقصد بخت و اتفاق کے ملاپ کا نتیجہ ہو سکتے ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا کی ہر مخلوق زبان حال سے یہ شہادت دے رہی ہے کہ اس کا ایک خالق ہے۔وہ ہرگز کسی اتفاق کا نہیں بلکہ ہر اعتبار سے ایک ارادے کا نتیجہ ہے۔سائنس نے اس کائنات کے عجائب کو جتنا واضح کیا ہے،اس کے بعد خدا کو ماننا اتنا ہی ضرور ہوجاتا ہے۔اصل بدقسمتی یہ ہے کہ خدا کو ماننے کے بعد اس کے نام پر جو مذاہب سامنے آتے ہیں وہ بھی کم نامعقول نہیں۔ایسے میں صرف دین اسلام ہے جس کی فطری اور متوازن تعلیمات ہر دور کے انسان کے لیے یکساں طور پر قابل قبول ہیں۔

اسلام اور لونڈیاں

مجھ سے مختلف حوالوں سے بار بار یہ سوال کیا جاتا ہے کہ اسلام میں لونڈیوں کا کیا تصور ہے۔ یہ سوال کیا جاتا ہے کہ قرآن مجید میں اگر ان کا ذکر آ گیا ہے تو قرآن مجید کے احکام کی ابدی نوعیت کے پیش نظر ان سے تمتع کرنا (جنسی تعلق قائم کرنا) ابھی بھی جائز ہونا چاہیے۔ بلکہ عملی طور پر بہت سے لوگ آج بھی گھریلو خادماؤں سے یا بے سہارا لڑکیوں کو اپنے پاس رکھ کر اسی بنیاد پر ان سے تعلق قائم کرتے ہیں۔اس کے ردعمل میں بعض حلقوں کی طرف سے یہ استدلال پیش کیا جاتا ہے کہ لونڈیاں بھی منکوحہ بیویاں ہی ہیں۔مگر ظاہر ہے کہ قرآن مجید کے کئی بیانات اس بات کی باصراحت نفی کرتے ہیں اس لیے یہ استدلال بالکلیہ رد کردیا جاتا ہے۔آج انشاء اللہ میں اسی نوعیت کے سوالات کا جواب دینے کی کوشش کروں گا۔

دو قسم کے احکام

اس معاملے میں بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ قرآن مجید میں اس حوالے سے بیان ہونے والے احکامات کی نوعیت کو درست طور پر سمجھا جاتا ہے نہ بیان کیا جاتا ہے۔ ہمارے نزدیک قرآن مجید میں مرد و زن کے تعلق کے حوالے سے دو طرح کے احکام پائے جاتے ہیں۔ایک احکام وہ ہیں جو نزول قرآن کے وقت رائج حالات کے پس منظر میں ہیں۔دوسرے احکام وہ ہیں جو بطور ابدی شریعت کے دیئے گئے ہیں۔

پہلی قسم کے احکام وہ ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے معاشرے میں لونڈیوں کی موجودگی کے باوجود ان سے تمتع کرنے کی اجازت دی تھی۔ یہ ایک مسلمہ تاریخی حقیقت ہے کہ نزول قرآن کے وقت گھر گھر لونڈیاں موجود تھیں۔ مگر اس کے باوجود قرآن مجید جب نازل ہوا تو اس نے لوگوں کو میاں بیوی کا تعلق قائم کرنے سے نہیں روکا اور اس حوالے سے کوئی قانونی ممانعت ہمیں نظر نہیں آتی۔ ان قرآنی بیانات کی مثالیں درج ذیل ہیں۔

مکی دور کی دو سورتوں (معارج 30:70، مومنون 6:23) میں ارشاد ہوتا ہے۔

''اور جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں مگر اپنی بیویوں سے یا (کنیزوں سے) جو ان کی مِلک ہوتی ہیں کہ (ان سے) مباشرت کرنے سے انہیں ملامت نہیں اور جو ان کے سوا اوروں کے طالب ہوں وہ (اللہ کی مقرر کی ہوئی حد سے) نکل جانے والے ہیں۔''

یہ اس ضمن کی صریح ترین آیت ہے کہ بیویوں کے علاوہ لونڈیوں سے تعلق قائم رکھنے کو قرآن نے اپنے نزول کے وقت ہرگز نہیں روکا تھا۔ یہی صورتحال ہجرت مدینہ کے بعد رہی۔ جنگ احد میں جب بہت سے مسلمانوں کی شہادت ہوگئی اور ہر دوسرے گھر میں بیواؤں اور یتیموں کا مسئلہ پیدا ہوا تو قرآن مجید نے اس موقع پر عرب کے ایک اور رواج یعنی دوسری شادی کو بطور حل پیش کیا۔ مگر ایک سے زیادہ شادیوں میں یہ شرط لگادی کہ چار سے زیادہ شادیاں نہ ہوں۔ ساتھ ہی تعدد ازواج کو عدل سے مشروط کردیا۔ پھر فرمایا کہ اگر بیویوں میں عدل نہ کرسکو تو پھر ایک سے زیادہ بیوی نہیں کرسکتے، ہاں لونڈیوں سے تمتع البتہ جائز ہے۔ ارشادی باری تعالیٰ ہے:

''اور اگر ڈر ہو کہ ان (بیویوں) کے درمیان عدل نہ کرسکو گے تو ایک ہی بیوی رکھو، یا پھر لونڈیاں جو تمھاری ملک میں ہوں''، (النساء 3:4)

پچھلی آیات کی طرح یہاں بھی بیوی کے ساتھ علیحدہ سے لونڈی کا ذکر یہ واضح کرتا ہے کہ جو لونڈیاں اس وقت موجود تھیں قرآن نے ان سے مقاربت کو جائز قرار دیا تھا اور بیویوں کی طرح اس کے لیے نکاح کے کسی تعلق کو لازم قرار نہیں دیا تھا۔

اس ضمن میں قرآن مجید میں آخری آیت خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے ہے جس میں آپ کو تعدد ازواج اور عدل کی مذکورہ بالا شرائط سے آزاد قرار دیا گیا ہے جن کی پابندی عام مسلمانوں کے لیے ضروری تھی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''اے پیغمبر ہم نے تمہارے لیے تمہاری بیویاں جن کو تم نے ان کے مہر دے دیے ہیں حلال کردی ہیں اور تمہاری لونڈیاں جو اللہ نے تم کو (کفار سے بطور مال غنیمت) دلوائی ہیں اور تمہارے چچا کی بیٹیاں اور تمہاری پھوپھیوں کی بیٹیاں اور تمہارے ماموؤں کی بیٹیاں اور تمہاری خالاؤں کی بیٹیاں جو تمہارے ساتھ وطن چھوڑ کر آئی ہیں (سب حلال ہیں) اور کوئی مومن عورت اگر اپنے تئیں پیغمبر کو بخش دے (یعنی مہر لیے بغیر نکاح میں آنا چاہے) بشرطیکہ پیغمبر بھی ان سے نکاح کرنا چاہیں (وہ بھی حلال ہے لیکن) یہ اجازت خاص تم ہی کو ہے سب مسلمانوں کو نہیں۔ ہم کو معلوم ہے جو کچھ ہم نے ان کی بیویوں اور لونڈیوں کے باب میں فرض کیا ہے۔ (یہ) اس لیے (کیا گیا ہے) کہ تم پر کسی طرح کی تنگی نہ رہے۔ اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

(اور تم کو یہ بھی اختیار ہے کہ) جس بیوی کو چاہو علیحدہ رکھو اور جسے چاہو اپنے پاس رکھو۔ اور جس کو تم نے علیحدہ کردیا ہو اگر اس کو پھر اپنے پاس طلب کرلو تو تم پر کچھ گناہ نہیں۔ یہ (اجازت) اس لیے ہے کہ ان کی آنکھیں ٹھنڈی رہیں اور وہ غمناک نہ ہوں اور جو کچھ تم ان کو دو اسے لے کر سب خوش رہیں۔ اور جو کچھ تمہارے دلوں میں

ہے اللہ اسے جانتا ہے۔اور اللہ جاننے والا اور بردبار ہے

(اے پیغمبر) ان کے سوا اور عورتیں تم کو جائز نہیں اور نہ یہ کہ ان بیویوں کو چھوڑ کر اور بیویاں کروخواہ ان کا حسن تم کو (کیسا ہی) اچھا لگے مگر وہ جو تمہاری مملوکہ ہوں۔اور اللہ ہر چیز پر نگاہ رکھتا ہے۔''، (الاحزاب33:50۔52)

اس آخری آیت میں جو پابندی لگائی ہے کہ اس متعین دائرے سے باہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے کوئی عورت حلال نہیں، اس میں بھی استثنا صرف لونڈیوں کا ہے کہ نکاح کے بغیر بھی آپ ان کو رکھ سکتے تھے۔

ان احکام و بیانات میں یہ بات واضح ہے کہ لونڈیوں سے تمتع کرنے کی اجازت علی الاطلاق بغیر کسی نکاح کے معاہدے کے صرف اس دور کے رواج کی بنا پر دی گئی ہے جس کے تحت ایک مرد کے لیے یہ جائز تھا کہ وہ محض حق ملکیت کی بنا پر لونڈی سے تعلق قائم کرے، جس طرح وہ نکاح کر کے ایک آزاد عورت سے تعلق قائم کر سکتا تھا۔

ابدی احکام

مرد وزن کے تعلق کے حوالے سے دوسری قسم کے احکام وہ ہیں جو قرآن مجید کی ابدی شریعت کا حصہ ہیں۔ان احکام میں قرآن مجید نے یہ بتایا ہے کہ مرد وزن کس بنیاد پر باہمی تعلق قائم کر سکتے ہیں۔قابل ذکر بات یہ ہے کہ ان مقامات پر صرف نکاح کے رشتے کا ذکر کر کے یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ صرف یہی وہ تعلق ہے جس کی بنیاد پر ایک مرد وعورت مقاربت کر سکتے ہیں۔ان مقامات پر لونڈیوں کا ذکر کیا ہی نہیں گیا اور جہاں کیا گیا ہے وہاں یہ ذکر نکاح کے حوالے سے ہے۔یہ احکام درج ذیل ہیں۔

''اور مشرک عورتوں سے جب تک وہ ایمان نہ لائیں نکاح نہ کرنا۔ایک مومن

لونڈی ایک (آزاد) مشرکہ سے بہتر ہے اگرچہ وہ تمھیں بھلی لگے۔اور مشرکوں کو جب تک وہ ایمان نہ لائیں (اپنی عورتیں) نکاح میں نہ دو۔ایک مومن غلام ایک مشرک سے بہتر ہے۔اگرچہ وہ تمھیں بھلا لگے''، (بقرہ2:221)

یہ نکاح کے حوالے سے قرآن کا ایک اہم حکم ہے جو یہ بتاتا ہے کہ کسی مشرک مرد یا عورت سے نکاح نہیں کیا جا سکتا۔قرآن صاف کہتا ہے کہ نکاح کے لیے ایک آزاد مشرک عورت سے مومن لونڈی بہتر ہے۔یہی معاملہ مومن غلام کا ہے کہ آزاد مشرک مرد سے بہتر ہے کہ ایک مومن غلام سے نکاح کا تعلق قائم ہو۔

سورہ مائدہ میں جب دین کا اتمام ہو رہا تھا اور شریعت کے آخری اور فیصلہ کن احکام دیے جا رہے تھے تو وہاں اس حکم میں ایک رعایت یہ دی گئی کہ اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح جائز ہے۔دیکھیے اس موقع پر لونڈیوں کا ذکر بالکل حذف کر دیا گیا ہے۔

''آج تمہارے لیے سب پاکیزہ چیزیں حلال کر دی گئیں ہیں......اور پاک دامن مومن عورتیں اور پاک دامن اہل کتاب عورتیں بھی (حلال ہیں) جبکہ ان کا مہر دے دو۔''، (مائدہ5:5)

مرد وزن کے نکاح کے ضمن میں بنیادی آیت سورہ نساء کی درج ذیل آیات ہیں۔جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ کن خواتین سے نکاح حرام ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''تم پر تمہاری مائیں اور بیٹیاں اور بہنیں اور پھوپھیاں اور خالائیں اور بھتیجیاں اور بھانجیاں اور وہ مائیں جنھوں نے تم کو دودھ پلایا ہو اور رضاعی بہنیں اور ساسیں حرام کر دی گئی ہیں اور جن عورتوں سے تم مباشرت کر چکے ہو ان کی لڑکیاں جنھیں تم پرورش کرتے (ہو وہ بھی تم پر حرام ہیں) ہاں اگر ان کے ساتھ تم نے مباشرت نہ کی

ہوتو (ان کی لڑکیوں کے ساتھ نکاح کر لینے میں) تم پر کچھ گناہ نہیں اور تمہارے صلبی بیٹوں کی عورتیں بھی اور دو بہنوں کا (ایک رشتہ نکاح میں) اکٹھا کرنا بھی (حرام ہے) مگر جو ہو چکا (سو ہو چکا) بے شک اللہ بخشنے والا (اور) رحم کرنے والا ہے۔

اور شوہر والی عورتیں بھی (تم پر حرام ہیں) مگر وہ جو (اسیر ہو کر لونڈیوں کے طور پر) تمہارے قبضے میں آ جائیں۔ یہ اللہ کا حکم ہے جس کی پابندی لازمی ہے۔ اور ان کے سوا اور عورتیں تم کو حلال ہیں اس طرح سے کہ مال خرچ کر کے ان سے نکاح کر لو......

اور جو شخص تم میں سے مومن آزاد عورتوں سے نکاح کرنے کا مقدور نہ رکھے تو مومن لونڈیوں میں ہی جو تمہارے قبضے میں آ گئی ہوں (نکاح کر لے) اور اللہ تمہارے ایمان کو اچھی طرح جانتا ہے تم آپس میں ایک دوسرے کے ہم جنس ہو تو ان لونڈیوں کے ساتھ ان کے مالکوں سے اجازت حاصل کر کے نکاح کر لو اور دستور کے مطابق ان کا مہر بھی ادا کر دو۔''، (نساء ۴: ۲۳۔ ۲۵)

اس آیت میں دو جگہ لونڈیوں کا ذکر ہے اور دونوں جگہ نکاح کے حوالے سے۔ یعنی اگر کوئی آزاد شادی شدہ عورت بطور لونڈی جنگ میں ہاتھ آ جائے تو پھر اسے نئے نکاح کے لیے پچھلے شوہر سے طلاق کی ضرورت نہیں بلکہ اس کا سابقہ نکاح کالعدم تصور ہوگا۔ اسی طرح آگے وضاحت کی گئی ہے کہ ایک لونڈی سے اس کے مالک کی اجازت سے نکاح کیا جا سکتا ہے۔

قرآن مجید کے یہی وہ مقامات ہیں جن میں مرد وزن کے تعلق کو موضوع بنایا گیا ہے اور ان کے سرسری مطالعے سے بھی یہ بات صاف ظاہر ہے کہ اسلامی شریعت جس کے احکام قیامت تک کے لیے ہیں جب مرد وزن کے تعلق کو موزوں بناتی ہے تو صرف اور صرف نکاح کو اس کی بنیاد ٹھہراتی ہے۔ لونڈی کی ملکیت یا کسی اور بنیاد پر مرد وزن کے تعلق کی کوئی اسلام کے ابدی

احکام میں نہیں۔

قرآن اور غلامی

اسلامی شریعت کے اس مدعا کی وضاحت کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر کیا سبب ہے کہ قرآن مجید نے اپنے نزول کے وقت لونڈیوں کے ساتھ مقاربت کو جائز قرار دیا۔ کیوں نہ ایسا ہوا کہ ایک حکم کے ذریعے سے لونڈی غلاموں کا رکھنا ہی حرام قرار دے دیا جاتا۔ اس کے برعکس نہ صرف پہلی قسم کے احکام قرآن میں پائے جاتے ہیں جن میں لونڈیوں سے مقاربت کی اجازت ہے بلکہ متعدد مقامات پر لونڈی غلاموں کا ذکر خادموں کی حیثیت سے بھی ہے۔ کیا واقعی ان احکام و بیانات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قرآن مجید غلامی کو برقرار رکھنا چاہتا تھا۔ کیا یہ واقعی اس کی منشا تھی کہ مسلمان جنگیں کر کے دوسرے لوگوں کو لونڈی غلام بنائیں۔ دنیا بھر سے معصوم بچے، بچیوں اور بڑوں کو حضرت یوسف کی طرح اغوا کیا جائے اور مسلمانوں کے بازاروں میں ان کی نیلامی ہو۔ مسلمانوں کے غلام ان کے کھیت اور کارخانوں کو چلا رہے ہوں اور لاتعداد لونڈیاں ان کے حرم میں سامان عیش کے طور پر موجود ہوں۔

ہم پورے اطمینان اور اعتماد سے یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ قرآن مجید کی ہرگز ہرگز یہ منشا نہیں تھی۔ قرآن مجید نے نہ لوگوں کو لونڈی غلام بنانے کی اجازت دی اور نہ ایسا کوئی حکم کبھی دیا گیا۔ ہم پھر اس بات کو دہرانا چاہیں گے کہ قرآن مجید نے نہ لوگوں کو لونڈی غلام بنانے کی اجازت دی اور نہ ایسا کوئی حکم کبھی دیا گیا۔ مسئلہ یہ تھا کہ غلامی کی لعنت ہزاروں برس سے انسانی معاشروں میں موجود تھی۔ قرآن مجید قطعی طور پر اس لعنت کو ختم کرنا چاہتا تھا۔ مگر اس مقصد کے لیے اسلام نے انقلابی طریقہ اختیار نہیں کیا کہ ایک حکم سے ساری لونڈی غلاموں کو آزاد قرار دے دیا جائے۔

انقلابی تبدیلیوں کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ جہاں ایک برائی کو ختم کرتی ہیں وہاں دس نئی

برائیوں کو جنم دیتی ہیں۔ اسی وجہ سے اسلام نے برائیوں کے خاتمے کے لئے بالعموم انقلاب (Revolution) کی بجائے تدریجی اصلاح (Evolution) کا طریقہ اختیار کیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں غلاموں کی حیثیت بالکل آج کے زمانے کے ملازمین کی تھی جن پر پوری معیشت کا دارومدار تھا۔ غلامی کے خاتمے کی حکمت عملی کو سمجھنے کے لیے اگر درج ذیل مثال پر غور کیا جائے تو بات کو سمجھنا بہت آسان ہوگا۔ خیال رہے کہ ہم اس مثال میں ملازمت کو غلامی جیسی برائی قرار نہیں دے رہے، بلکہ حکمت عملی کے پہلو سے ایک ایسی مثال پیش کر رہے ہیں جسے آج کا انسان باآسانی سمجھ سکتا ہے۔

ملازمت کی مثال

موجودہ دور میں بہت سے مالک (Employers) اپنے ملازمین کا استحصال کرتے ہیں۔ ان سے طویل اوقات تک بلا معاوضہ کام کرواتے ہیں، کم سے کم تنخواہ دینے کی کوشش کرتے ہیں، بسا اوقات ان کی تنخواہیں روک لیتے ہیں، خواتین ملازموں کو بہت مرتبہ جنسی طور پر ہراساں کیا جاتا ہے۔ ان حالات میں آپ ایک مصلح ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ دنیا سے ملازمت کا خاتمہ ہو جائے اور تمام لوگ آزادانہ اپنا کاروبار کرنے کے قابل ہو جائیں۔ آپ نہ صرف ایک مصلح ہیں، بلکہ آپ کے پاس دنیا کے وسیع و عریض خطے کا اقتدار بھی موجود ہے اور آپ اپنے مقصد کے حصول کے لیے بہت کچھ کر سکتے ہیں۔

ان حالات میں آپ کا پہلا قدم کیا ہوگا؟ کیا آپ یہ قانون بنا دیں گے کہ آج سے تمام ملازمین فارغ ہیں اور آج کے بعد کسی کے لیے دوسرے کو ملازم رکھنا ایک قابل تعزیر جرم ہے؟ اگر آپ ایسا قانون بنائیں گے تو اس کے نتیجے میں کروڑوں بے روزگار وجود پذیر ہوں گے۔ یہ بے روزگار یقیناً روٹی، کپڑے اور مکان کے حصول کے لیے چوری، ڈاکہ زنی، بھیک اور جسم

فروشی کا راستہ اختیار کریں گے۔ جس کے نتیجے میں پورے معاشرے کا نظام تلپٹ ہو جائے گا اور ایک برائی کو ختم کرنے کی انقلابی کوشش کے نتیجے میں ایک ہزار برائیاں پیدا ہو جائیں گی۔

یہ بات بالکل واضح ہے کہ ملازمت کے مسئلے کو حل کرنے کے لئے تدریجی اصلاح کا طریقہ ہی کارآمد ہے۔ اس طریقے کے مطابق مالک و ملازم کے تعلق کی بجائے کوئی نیا تعلق پیدا کیا جائے گا۔ لوگوں میں یہ شعور پیدا کیا جائے گا کہ وہ اپنے کاروبار کو ترجیح دیں۔ انہیں کاروبار کرنے کی تربیت دی جائے گی۔ جو لوگ اس میں آگے بڑھیں، انہیں بلاسود قرضے دیے جائیں گے اور تدریجاً تمام لوگوں کو ملازمت کی غلامی سے نجات دلا کر مکمل آزاد کیا جائے گا۔

عین ممکن ہے کہ اس سارے عمل میں صدیاں لگ جائیں۔ ایک ہزار سال کے بعد، جب دنیا اس مسئلے کو حل کر چکی ہو تو ان میں سے بہت سے لوگ اس مصلح پر تنقید کریں اور یہ کہیں کہ انہوں نے فوری طور پر ایسا کیوں نہیں کیا، ویسا کیوں کیا مگر اس دور کے انصاف پسند یہ ضرور کہیں گے کہ اس عظیم مصلح نے اس مسئلے کے حل کے لیے تدریج کا فطری طریقہ اختیار کیا تھا۔ اور ایسا نہ کیا جاتا تو معاشرہ تباہ و برباد ہو جاتا۔

اب اسی مثال کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم پر منطبق کیجیے۔ اسلام غلامی کا آغاز کرنے والا نہیں تھا، بلکہ وہ اسے ورثے میں ملی تھی۔ اسلام کو اس مسئلے سے نمٹنا تھا۔ عرب میں بلا مبالغہ ہزاروں لونڈی غلام موجود تھے۔ وہ زندگی کے ہر میدان میں کام کر رہے تھے۔ اگر ان سب غلاموں کو ایک ہی دن میں آزاد کر دیا جاتا تو نتیجہ اس کے سوا کچھ نہ نکلتا کہ ہزاروں کی تعداد میں طوائفیں، ڈاکو، چور، بھکاری وجود میں آتے جنہیں سنبھالنا شاید کسی کے بس کی بات نہ ہوتی۔ چنانچہ اسلام نے ایک تدریجی طریقے سے اس مسئلے کو حل کیا۔ اس ضمن میں جو اقدامات کیے گئے ان میں سے کچھ اہم یہ ہیں:

غلامی ختم کرنے کے اقدامات

۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو غلاموں کے ساتھ عمدہ برتاؤ کرنے کی تربیت دی۔ انہیں یہ حکم دیا کہ جو تم خود کھاؤ وہی انہیں کھلاؤ، جو خود پہنو، وہی انہیں پہناؤ اور ان کے کام میں ان کی مدد کرو۔ غلاموں کو اپنا بھائی سمجھو، ان کا خیال رکھو اور ان پر ظلم نہ کرو۔ اسی تربیت کا نتیجہ یہ نکلا کہ صحابہ اپنے غلاموں سے اچھا برتاؤ کرنے لگے اور ان کا معیار زندگی بلند ہوگیا۔ سیرت وروایات کے ذخیرے میں ایسی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ سیدنا ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ اور ان کے غلام کو دیکھ کر یہ پہچاننا مشکل تھا کہ آقا کون ہے اور غلام کون ہے۔ سیدہ اسماء رضی اللہ عنہا اپنے غلاموں سے بیٹوں کا سا سلوک کرتیں وغیرہ۔

۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو حکم دیا کہ اپنے غلاموں اور لونڈیوں کو اعلیٰ اخلاقی تربیت دیں اور انہیں آزاد کردیں۔ لونڈیوں کو آزاد کرنے کے بعد ان سے شادی کرنے کو ایسا کام قرار دیا جس پر اللہ تعالیٰ کے حضور دوہرے اجر کی نوید ہے۔ بعد کے دور میں ہمیں ایسے بہت سے غلاموں یا آزاد کردہ غلاموں کا ذکر ملتا ہے جو علمی اعتبار سے جلیل القدر علما صحابہ کے ہم پلہ تھے۔ ایک مثال سیدنا سالم رضی اللہ عنہ تھے جن کا شمار ابی بن کعب، عبداللہ بن مسعود اور معاذ بن جبل رضی اللہ عنہم جیسے جلیل القدر صحابہ میں ہوتا ہے۔

۔مثال قائم کرنے کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے تمام غلام آزاد کیے یہاں تک کہ اپنی وفات کے وقت آپ کے پاس کوئی غلام نہ تھا۔ آپ کے جلیل القدر صحابہ کا بھی یہی عمل تھا۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنی دولت سے ایسے غلام خرید کر آزاد کیے جن پر ان کے مالک اسلام لانے کے باعث ظلم کرتے تھے۔ صحابہ کی تاریخ میں ایسے بہت سے غلاموں کا ذکر ملتا ہے جو آزاد کیے گئے تھے۔ ان کے حالات پر کئی کتابیں بھی لکھی گئیں جو کتب الموالی کہلاتی ہیں۔

۔دور جاہلیت میں آزاد کردہ غلاموں کو بھی کوئی معاشرتی مقام حاصل نہ تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ان کے سابقہ مالکوں کا ہم پلہ قرار دیا۔

۔ایسے غلام جو آزادی کے طالب تھے، ان کی آزادی کے لیے قرآن نے " مکاتبت " کا دروازہ کھولا۔ اس کے مطابق جو غلام آزادی کا طالب تھا، وہ اپنے مالک کو اپنی مارکیٹ ویلیو کے مطابق قسطوں میں رقم ادا کر کے آزاد ہوسکتا تھا۔ صحابہ کرام ایسے غلاموں کی مالی مدد کرتے جو مکاتبت کے ذریعے آزاد ہونا چاہتے تھے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایک لونڈی بریرہ رضی اللہ عنہا کے مالک کو رقم ادا کر کے انہیں آزاد کروایا تھا۔ قرآن نے حکومتی خزانے میں سے ایسے غلاموں کی مالی امداد کا حکم دیا ہے۔ یہ وہ حکم تھا جس نے تدریجی اور قانون طریقے سے غلامی کی لعنت کے خاتمے کی بنیاد رکھ دی۔

۔غلامی کی سب سے بڑی جڑ جنگی قیدی تھے جن کو غلام بنایا جاتا تھا۔ قرآن نے جنگی قیدیوں کے بارے میں یہ حکم دیا کہ یا تو انہیں بلا معاوضہ آزاد کردیا جائے یا پھر ان سے جنگی تاوان وصول کر کے آزاد کیا جائے۔ اس طرح نئے غلام اور کنیزیں بننے کا سلسلہ رک گیا۔

قرآن مجید میں غلامی کی ممانعت کا حکم

غلامی کے خاتمے کے حوالے سے دین اسلام کی اس تمام تر تعلیمات کے باوجود بہت سے لوگ چھوٹے ہی یہ سوال کردیتے ہیں کہ قرآن میں غلامی کی ممانعت کا حکم کہاں ہے۔ یہ حکم جب نہیں ہے تو ہم آزاد خواتین کو پکڑ کر لونڈیاں بنانے میں حق بجانب ہیں۔ اس کا سادہ ترین جواب تو میں یہ دیا کرتا ہوں کہ یہ استدلال پیش کرنے والے یہ بات تسلیم کررہے ہیں کہ کوئی طاقتور شخص یا کوئی دشمن ملک بالجبر ان کی اپنی خواتین کے ساتھ یہ سب کچھ کرے تو وہ حق بجانب ہوگا۔ کیا وہ اس ظلم کو ایک لمحے کے لیے بھی جائز تسلیم کریں گے؟

اس بات کا علمی جواب یہ ہے کہ قرآن مجید چیزوں کو حرام قرار دینے کے لیے دو طریقے اختیار کرتا ہے۔ایک یہ کہ کسی چیز کا نام لے کر ممنوع قرار دے دیا جائے۔جیسے قرآن مجید تجسس کی ممانعت کرتے ہوئے یہ کہتا ہے کہ و لاتـــجسســـو ا (الحجرات 12:49)۔یعنی تم تجسس نہ کرو۔ دوسرا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ گناہوں کی عمومی کیٹیگری کو ممنوع قرار دے دیا جائے۔اس کیٹیگری کے ذیل میں آنے والی تمام چیزیں خود ہی ممنوع ہو جاتی ہیں اور قرآن کریم میں ان کی ممانعت کا حکم تلاش کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔مثلاً ایک شخص یہ کہے کہ قرآن پاک میں سور کھانے کی تو ممانعت ہے البتہ سانپ کھانے کی نہیں ہے اس لیے سانپ کھانا جائز ہو گیا۔یہی معاملہ تمام درندوں اور بول و براز وغیرہ کا ہے۔آپ کو ان کی ممانعت کا براہ راست حکم قرآن مجید میں نہیں ملے گا۔

ایسی چیزوں کی حرمت میں جیسا کہ بیان ہوا کہ قرآن مجید کا طریقہ یہ ہے کہ عمومی کیٹیگری بیان ہو جاتی ہے۔چنانچہ قرآن مجید اسی اصول پر خبائث کو حرام قرار دیتا ہے اور فرماتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کھانے پینے کے لیے صرف طیبات ہی حلال قرار دیے ہیں،(المائدہ 5:5)۔چنانچہ سانپ، شیر، چیتے اور بول و براز وغیرہ اس وجہ سے حرام ہو جاتے ہیں کہ انسان ان کو فطری طور پر خبیث چیزوں کے طور پر جانتا ہے۔خیال رہے کہ استثنائی طور پر اگر کوئی واقعہ اس نوعیت کا ہو جائے کہ ایک شخص یا گروہ یہ خبیث چیزیں کھانے لگے تو اس سے ان کی فطری حیثیت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔

حرمت کی ایسی ہی ایک کیٹیگری وہ ہے جس میں قرآن بـــغـــی یا زیادتی کو ممنوع قرار دیتا ہے،(اعراف 33:7)۔اب اس کے بعد ضروری نہیں رہتا کہ قرآن مجید ظلم کی ہر قسم کا نام لے کر یہ بیان کرے کہ فلاں زیادتی ناجائز ہے اور فلاں ظلم حرام ہے۔ بلکہ انسانی فطرت اور

معاشرے جس جس چیز پر ظلم کا اطلاق کرتے ہیں وہ خود بخود اسی اصول پر حرام ہو جائے گا۔کسی انسان کی آزادی کو سلب کر کے اسے غلام بنا لینا اسی نوعیت کی چیز ہے۔چنانچہ غلامی اسی اصول پر حرام ہے کیونکہ اس میں لوگوں کی آزادی پر حملہ کر کے اور ان کی عزت اور آزادی پامال کر کے انھیں غلام بنایا جاتا ہے، بالجبر ان سے مشقت لی جاتی ہے اور دیگر طریقوں سے انھیں ظلم کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔چنانچہ غلامی ہر حال میں ایک برائی تھی اور اسے گوارا کرنا اسلام کے لیے کسی طور ممکن نہ تھا۔مگر جیسا کہ بار بار بیان ہوتا ہے کہ یہ برائی اتنی زیادہ پھیل چکی تھی کہ نہ صرف اس کی برائی کا تاثر ختم ہو چکا تھا بلکہ پورا معاشرتی نظام اسی پر منحصر ہو چکا تھا اس لیے دین اسلام نے اس برائی کے خاتمے میں تدریج کا طریقہ اختیار کیا۔اسلام دین فطرت ہے۔وہ برائی کو بھی غیر فطری طریقے پر ختم نہیں کرتا۔

چنانچہ جو لوگ آج غلامی اور خاص کر خواتین کو لونڈی بنا کر ان سے استفادہ کے قائل ہیں اور اس کے لیے یہ دلیل دیتے ہیں کہ قرآن میں غلامی کے خاتمے کا کوئی حکم نہیں وہ سرتاسر غلطی پر ہیں۔قرآن مجید ظلم و زیادتی کی ہر قسم کو حرام کرتا ہے۔غلامی اس ظلم کی بدترین شکل ہے اور اس کا دوبارہ شروع کرنا ایک بدترین جرم ہے۔مزید یہ بھی واضح رہے کہ قدیم دور میں غلامی کا جو سب سے بڑا ذریعہ تھا یعنی جنگی قیدیوں کو غلام بنانا، ان کے متعلق قرآن مجید نے تصریح کر دی ہے کہ ان کو فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے گا ورنہ بلا معاوضہ آزاد کر دیا جائے گا،(محمد 4:41)۔غلام کسی صورت میں نہیں بنایا جائے گا۔اس کی سب سے بڑی مثال جنگ بدر کے غریب قیدی ہیں جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھانے کے عوض آزاد کر دیا تھا۔

غلامی ختم کیوں نہ ہو سکی

اس ضمن کا ایک آخری اور اہم ترین سوال یہ ہے کہ ان تمام اقدامات کے بعد بھی مسلم

معاشرے میں غلامی ختم کیوں نہ ہوسکی۔ کیوں ایسا ہوا کہ بیسویں صدی تک عرب کے معاشرے میں لونڈی غلام بازاروں میں بکتے رہے؟

ہمارے نزدیک اس معاملے میں اصل سانحہ یہ ہوا کہ خلافت راشدہ میں جب عرب مسلمانوں نے عالم عجم کو فتح کیا، ان فتوحات کے نتیجے میں لاکھوں مربع میل پر پھیلی قیصر و کسریٰ کی عظیم سلطنتوں میں پائے جانے والے لاکھوں بلکہ کروڑں غلام اسلامی معاشرے میں ایک دم داخل ہوگئے۔ یہ واضح ہے کہ عرب معاشرے میں موجود ہزاروں غلاموں کو بیک جنبش قلم ختم نہیں کیا گیا تو یہ کام عجم کے لاکھوں غلاموں کے معاملے میں بھی ممکن نہ تھا۔ صحابہ کرام نے اپنی حد تک یہ کام جاری رکھا مگر اول ان کی اصل توجہ جہاد کی طرف رہی اور پھر خلافت راشدہ کے نصف آخر میں مسلمانوں کا باہمی خلفشار شروع ہوگیا۔ دوسری طرف وقت گزرنے کے ساتھ قرآن مجید کا فہم رکھنے والے اور اسلامی روح کو سمجھنے والے صحابہ کرام کی تعداد تیزی سے کم ہوتی گئی۔

یہاں تک کہ خلافت راشدہ کے بعد بنو امیہ کے دور میں جب باہمی جنگوں کا یہ سلسلہ تھما تو مسلم معاشرہ ملوکیت کی اجتماعی غلامی کا شکار ہو چکا تھا۔ جو معاشرہ اجتماعی غلامی کا شکار ہو وہ انفرادی غلامی کے لیے کیا کرسکتا تھا۔ چنانچہ سب نے غلامی کو ایک ناقابل تبدیل حقیقت کے طور پر قبول کرلیا اور رفتہ رفتہ غلامی کی لعنت کو مذہبی جواز بھی ملتا چلا گیا۔

کیا اللہ اور خدا الگ الگ ہیں؟

پچھلے دنوں ایک صاحب ملاقات کے لیے تشریف لائے۔ گفتگو کے دوران میں انہوں نے یہ بیان کیا کہ میری کتابیں جب وہ بعض لوگوں کو دیتے ہیں تو وہ اس پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ ان کتابوں میں اللہ تعالیٰ کے لیے خدا کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے لیے لفظ خدا کا استعمال اس کی توہین کے مترادف ہے، اس لیے وہ میری کتابوں اور تحریروں کو مفید سمجھنے کے باجود دوسروں تک نہیں پہنچا سکتے۔ یہ صرف ایک ہی واقعہ نہیں ہے۔ بہت سے لوگ مجھ سے لفظ خدا کے استعمال کے بارے میں ایسی ہی رائے کا اظہار کر چکے ہیں۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ اس مسئلے کا علمی جائزہ لیا جائے۔

قرآن کا فیصلہ

اللہ تعالیٰ کا کیا نام درست ہے اور کیا نہیں۔ کس نام کو اس کی طرف نسبت دی جاسکتی ہے اور کس کو نہیں، اس کا فیصلہ نزول قرآن کے وقت ہی ہوگیا تھا۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ایک نام 'الرحمٰن' بیان ہوا ہے۔ الرحمٰن کا لفظ عربی زبان کا معروف لفظ تھا جس سے مشرکین عرب واقف تھے۔ تاہم ذاتِ باری تعالیٰ کے لیے وہ اللہ کا لفظ استعمال کرتے تھے۔ جبکہ اللہ تعالیٰ کے نام کے طور پر الرحمٰن کا لفظ زیادہ تر اہل کتاب میں استعمال ہوتا تھا۔ قرآن کریم نے بھی بعض مقامات پر اس نام کو اللہ تعالیٰ کے ذاتی نام کے طور پر استعمال کیا۔ مثلاً سورہ الرحمٰن میں ارشاد باری تعالیٰ

ہے۔

''الرحمٰن نے اس قرآن کی تعلیم دی ہے۔''،(الرحمٰن55:1-2)

جب قرآن نے لفظ الرحمٰن کو استعمال کیا تو مشرکین،عرب جو مخالفت پر تلے بیٹھے تھے، انہوں نے ااس بات کو اچھالنا شروع کر دیا۔قرآن کریم میں مشرکین کے ردعمل کو اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

''جب ان سے کہا جاتا ہے کہ الرحمٰن کو سجدہ کرو تو کہتے ہیں: الرحمٰن کیا ہے؟ کیا ہم اس چیز کو سجدہ کریں جس کا تم ہمیں حکم دیتے ہو؟ اور یہ چیز ان کی نفرت کو اور بڑھاتی ہے۔''،(الفرقان60:25)

یہ چونکہ توحید کا مسئلہ تھا، جس کی وضاحت قرآن کا بنیادی موضوع ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ غلط فہمی دور کردی کہ اللہ کے سوا کسی اور نام سے ذات باری تعالیٰ کو پکارنا غلط ہے۔فرمایا:

''اے نبی انہیں بتادو تم اللہ کہہ کر پکارو یا الرحمٰن کہہ کر، جس نام سے بھی پکارو، اس کے لیے سب اچھے ہی نام ہیں۔''،(بنی اسرائیل110:17)

یہ آیت ٹھیک اس مسئلے کے بارے میں بھی ایک قطعی فیصلہ دے دیتی ہے جو لفظ خدا کے حوالے سے آج درپیش ہے۔ یہ نص قطعی ہے جو صاف بیان کر رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو نہ صرف الرحمٰن کہہ کر پکارنا درست ہے بلکہ ہر وہ اچھا نام جو اللہ تعالیٰ کی ہستی کے لیے کسی زبان، علاقے یا قوم میں رائج ہے، اس نام سے اللہ تعالیٰ کو پکارنا بالکل جائز ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کسی خاص قوم یا علاقے کے رب نہیں، بلکہ رب العالمین ہیں۔ ان کا تصور ہر گروہ اور ہر زمانے میں پایا جاتا رہا ہے۔لوگوں نے اپنی اپنی زبانوں میں اللہ تعالیٰ کے لیے مختلف الفاظ استعمال کیے ہیں۔

مگر ان سب ناموں سے مراد ایک ہی ہستی ہوتی ہے۔ جسے اہل عرب نزول قرآن کے وقت اللہ کہتے تھے۔

یہ ایسا ہی ہے جیسے زمین کا تصور ہر قوم، گروہ اور علاقے میں پایا جاتا ہے۔مگر ہر اہل عرب اسے ارض، انگریز ارتھ اور ہم لوگ زمین کہتے ہیں۔ کیا ان تین مختلف ناموں سے زمین کے تصور میں تبدیلی آ گئی؟ یہی بات اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں واضح کی ہے۔ اب صرف ایک سوال کا جواب باقی ہے کہ کیا ہماری زبان میں 'خدا' کوئی اچھا لفظ ہے یا نہیں۔ اس کا جواب ہمیں لغت میں مل جاتا ہے۔ اردو ڈکشنری بورڈ کی شائع کردہ اردو زبان کی سب سے بڑی اور مستند لغت میں خدا کے لفظ کے تحت لکھا ہے۔

''بندے کے مقابل، خالق کائنات کا ذاتی نام اور خود اس کی ذات جس کے صفاتی نام ننانوے ہیں اور جو اپنی ذات وصفات کے ساتھ ہر جگہ موجود ہے، وہ ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا، وہ یکتا ہے اور اس کا مثل کوئی نہیں۔'' 460/8

کیا اس وضاحت کے بعد لفظ خدا کے استعمال کے بارے میں کوئی شک وشبہ باقی رہ جاتا ہے۔ اردو لغت والوں نے لفظ خدا کے یہ معنی گھر بیٹھے تخلیق نہیں کیے ہیں۔ اہل زبان جب کبھی لفظ خدا کو زبان سے ادا کرتے ہیں، وہ جب خدا کی قسم کھاتے ہیں، وہ جب گواہ بناتے ہیں ان کے ذہن میں اللہ کے سوا کسی اور کا تصور تک نہیں ہوتا۔ کسی زبان کی اصل سند اس کے اساتذہ کا کلام ہوتا ہے۔ دیکھیے کہ اردو زبان کے اساتذہ کس طرح خدا کے لفظ کو اللہ تعالیٰ ہی کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ میر کا شعر ہے:

اب تو جاتے ہیں میکدے سے میر
پھر ملیں گے اگر خدا لایا

غالب کہتے ہیں:

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

اقبال کہتے ہیں:

خدا کے بندے تو ہیں ہزاروں بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا

دورِ حاضر کے معروف نعت ثناخواں شاعر مظفر وارثی کی حمد کا یہ شعر تو بچے بچے کو یاد ہے:

کوئی تو ہے جو نظامِ ہستی چلا رہا ہے
وہی خدا ہے وہی خدا ہے

یہ اشعار جب سنے جاتے ہیں تو ذہن میں سوائے اللہ تعالیٰ کے، کسی اور کا تصور نہیں ہوتا۔

انبیا کا طریقہ

سورہ بنی اسرائیل کی آیت اس بحث میں فیصلہ کن ہے۔ مگر ذرا اور آگے چلیے اور دیکھیے کہ انبیا کا کیا طریقہ تھا۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کا لقب اسرائیل تھا۔ یہ لفظ دو اجزا سے مرکب ہے۔ اِسرا اور ایل۔ قدیم عبرانی زبان میں اللہ تعالیٰ کو 'ایل' کے لفظ سے پکارا جاتا تھا۔ جبکہ اِسر کے معنی بندے کے ہیں۔ سو ان کے لقب اسرائیل کا مطلب ہوا 'ایل' یعنی اللہ کا بندہ۔ اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان عبرانی تھی۔ 86 برس کی عمر میں ان کے دعا کے جواب میں جب اللہ تعالیٰ نے ان کو بیٹا عطا فرمایا تو آپ نے ان کا نام اسماعیل رکھا۔ اس نام کا مطلب ہے کہ 'ایل' یعنی اللہ تعالیٰ نے سنا۔

اللہ تعالیٰ نے نہ صرف ان انبیا کے زمانے پر اس بات پر کوئی ممانعت نہیں کی بلکہ قرآن میں

ان دونوں ناموں کو ذکر کر کے قیامت تک اس حقیقت پر مہرِ صداقت ثبت کر دی کہ کسی زبان میں اللہ تعالیٰ کے لیے جو لفظ بھی رائج ہے، اللہ تعالیٰ کو وہ قبول ہے۔ چاہے وہ عربی لفظ ہو یا عبرانی، ہندی ہو یا یونانی، اردو ہو یا فارسی۔ اللہ کی کوئی مخصوص زبان نہیں۔ ساری زبانیں اسی کی ہیں۔ اسی سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے لیے عربی کے علاوہ کسی اور زبان کے لفظ کے استعمال پر کوئی اعتراض نہیں ہے وگرنہ لازماً قرآن ان پیغمبروں کے نام بدل کر استعمال کرتا یا انہی پیغمبروں کے زمانے میں ان کے ناموں کی تصحیح کرا دیتا۔

لفظ 'خدا' کے شرعی عیوب

عام طور پر یہ بیان کیا جاتا ہے کہ لفظ خدا میں بڑی شرعی قباحتیں ہیں۔ مثلاً یہ غیر اللہ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اردو میں اس کی جمع بھی استعمال ہوتی ہے۔ یہ فارسی میں بدی کی طاقت کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

آیئے لفظ خدا پر ان اعتراضات کا بھی جائزہ لے لیتے ہیں۔ اس سلسلے میں پہلی بات یہ ہے کہ اردو زبان میں لفظ 'خدا' جب تنہا استعمال ہوتا ہے تو اس سے مراد وہی ہستی ہوتی ہے جسے اللہ تعالیٰ کہتے ہیں۔ جیسا کہ اوپر ہم نے اردو زبان میں خدا کے معنی کے تحت بیان کیا ہے۔

دوسری بات یہ کہ بدی کی طاقت کے لیے فارسی زبان میں لفظ اہرمن کا استعمال ہوتا ہے نہ کہ خدا کا۔ خدا کا لفظ تنہا جب کبھی آتا ہے اس کے معنی کبھی بدی کے خدا کے نہیں ہوتے۔ تاہم اردو اور فارسی زبان میں لفظ خدا مالک، بادشاہ اور آقا کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس پس منظر میں اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں لفظ خدا کے ساتھ کوئی اور لفظ ملتا ہے اور غیر اللہ کے لیے استعمال ہو جاتا ہے۔ جیسے فارسی میں بدی کی طاقت کو خدائے اہرمن کہتے ہیں۔ اسی طرح اردو زبان میں میر تقی میر کو خدائے سخن کہا جاتا ہے۔ اسی طرح یہ بات بھی ٹھیک ہے کہ خدا

کے لفظ کی جمع بھی اردو زبان میں مستعمل ہے۔

مگر کیا ان وجوہات کی بنا پر لفظ خدا کا استعمال غلط ہو گیا۔ ہر گز نہیں۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ کے لیے عربی کا ایک ایسا لفظ کثرت سے استعمال ہوا ہے، جس میں نہ صرف یہ سارے شرعی عیب پائے جاتے ہیں، بلکہ کچھ مزید عیب ہیں جو لفظ خدا میں نہیں ہیں۔ آیئے دیکھتے ہیں وہ کیا لفظ ہے۔

قرآن میں جگہ جگہ اللہ تعالیٰ کو رب کہا گیا ہے۔ قرآن و حدیث میں منقول بے شمار دعائیں اس لفظ سے شروع ہوتی ہیں۔ مگر یہ لفظ انسان کے لیے عربی میں عام استعمال ہوتا ہے اور قرآن کریم نے بھی استعمال کیا ہے۔ مثلاً سورہ یوسف میں ہے کہ جب حضرت یوسف علیہ السلام سے دو قیدیوں نے اپنے خواب کی تعبیر پوچھی تو انہوں نے تعبیر دیتے وقت ان کے آقا کے لیے جو لفظ کہا، قرآن نے اس کے لیے 'رب' کا لفظ استعمال کیا۔

"اَمَّآ اَحَدُکُمَا فَیَسۡقِیۡ رَبَّہٗ خَمۡرًا" (یوسف 41:12)

''تم میں ایک اپنے آقا کو شراب پلائے گا۔''

اسی آیت سے ذرا قبل ہی اس لفظ کی جمع ''ارباب''، اہل مصر کے ان دیوی دیوتاؤں کے لیے استعمال کی گئی، جنہیں اہل مصر پوجتے تھے۔

ءَ اَرۡبَابٌ مُّتَفَرِّقُوۡنَ خَیۡرٌ اَمِ اللّٰہُ الۡوَاحِدُ الۡقَھَّارُ (یوسف 39:12)

''کیا بہت سے جدا جدا رب بہتر ہیں یا وہ ایک اللہ جو سب پر غالب ہے؟''

جمع کے علاوہ اس لفظ کی مونث بھی عربی میں مستعمل ہے جبکہ لفظ خدا کم از کم اس عیب سے تو بری ہے۔ ایک بہت مشہور حدیث جسے حدیثِ جبریل کہا جاتا ہے، اس کے الفاظ ہیں۔

ان تلد الامة ربتها (مسلم رقم 8)

''(قیامت کی ایک نشانی یہ ہے) کہ لونڈی اپنی مالکن کو جنے گی۔''

جب اس سب کے باوجود قرآن نے بلا جھجک اس لفظ کو اللہ تعالیٰ کے لیے استعمال کیا ہے تو خدا کے لفظ کو اللہ تعالیٰ کے لیے استعمال کرنے میں کیا چیز مانع ہے۔ یاد رہے کہ موجودہ اردو زبان میں یہ لفظ اب اللہ تعالیٰ کے لیے خاص ہو چکا ہے۔ جسے اس بات میں شبہ ہو وہ اپنے استاد، دفتر یا دکان کے مالک یا صدر مملکت کو اس لفظ سے پکارے اور دیکھے کہ ارد گرد کے لوگ اس کے ساتھ کیا کرتے ہیں۔

مسئلہ دعوتِ دین کا ہے

ہمارے نزدیک اس قسم کا نقطہ نظر اللہ تعالیٰ کو اپنا قومی معبود قرار دینے کے ہم معنی ہے۔ جس کے نتیجے میں اسلامی دعوت کو زبردست نقصان پہنچے گا۔ اس کے بعد ایک مسلمان جب دعوت دین کے لیے اٹھے گا تو وہ کسی انگریز عیسائی کو یہ بتائے گا کہ تم جس ہستی کو God کہتے ہو بالکل غلط ہے۔ تمہیں میرے اللہ کی عبادت کرنی چاہیے۔ اسی طرح وہ ایک ہندو سے کہے گا کہ تم ایشور کے ماننے والے ہو جبکہ تمہیں اللہ کو ماننا چاہیے۔ اس کے نتیجے میں دوسرا فریق یہ سمجھے گا کہ مجھے میرے معبود سے ہٹا کر کسی اور معبود کی طرف لایا جا رہا ہے۔ پھر اس کے دل میں ایک اجنبیت اور وحشت پیدا ہو گی اور عین ممکن ہے کہ یہی اجنبیت قبول حق کی راہ میں رکاوٹ بن جائے۔

یہی سبب ہے کہ انبیا کا طریقہ بالکل مختلف ہوتا ہے۔ وہ کبھی نام پر بحث نہیں کرتے، شرک پر بحث کرتے ہیں۔ ان صفات پر بحث کرتے ہیں جو اللہ سے منسوب کر دی جاتی ہیں۔ آپ قرآن میں کبھی اس گفتگو کو پڑھیے جو انبیا و رسل اور ان کی اقوام کے بیچ میں ہوئی ہے۔ اس میں سارا زور توحید کو منوانے پر ہے۔ قرآن بیان کرتا ہے کہ تمام رسول اپنی قوم کی زبان ہی بولتے تھے۔ (ابراہیم 4:14)۔ ان رسولوں کی اقوام اپنی زبان میں یقیناً اللہ تعالیٰ کو کسی نہ کسی نام سے پکارتی ہوں گی۔ وہ رسول بھی اسی نام سے اللہ کو پکارتے تھے۔ مگر وہ کہتے تھے کہ تم جسے رب

العالمین مانتے ہو اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔تنہا اسی کی عبادت کرو۔

آج ہمارے لیے بھی یہی طریقہ آئیڈیل ہے۔اور ہم اس طریقے پر تب ہی عمل کر سکتے ہیں جب ہم ظاہر پرستی سے باہر نکل کر یہ جان سکیں کہ اللہ ایک ہے اور سارے اچھے نام اسی کے ہیں۔پھر یہ ممکن ہوگا کہ ایک امریکی کو ہم یہ بتا سکیں گے کہ تم God کی عبادت کرتے رہو،لیکن اس کے ساتھ کسی کو شریک مت ٹھہراؤ۔کسی کو اس کا بیٹا اور بیوی نہ قرار دو۔ایک ہندو کو ہم بتا سکیں گے کہ یہ ٹھیک ہے کہ خالق کائنات ایشور ہی ہے مگر دیکھو اس کے ساتھ کسی دیوی دیوتا یا اوتار کو معبود نہ مانو۔

اس کے بعد وہ شخص جب اسلام قبول کر کے نماز پڑھے گا،قرآن پڑھے گا،دین کے مقرر کردہ دیگر اعمال ادا کرے گا تو وہاں وہ اللہ ہی کا نام لے گا۔مگر یہ حق کسی کو نہیں کہ وہ اس کی زبان بدلوانے کی کوشش کرے۔اسے اجازت ملنی چاہیے کہ وہ اپنی زبان میں اللہ کو جو چاہے کہہ کر پکارے۔کیوں کہ سارے اچھے نام اللہ ہی کے لیے ہیں۔یہ حق اسے اللہ تعالیٰ نے دیا ہے اور کوئی اس سے اس کا یہ حق نہیں چھین سکتا۔

اعتراضات ختم نہیں ہوسکتے

میرا تجربہ ہے کہ جو لوگ ایسا کوئی کا نقطہ نظر اختیار کر کے اس کے مبلغ بن جاتے ہیں،وہ کسی علمی استدلال کو نہیں سمجھتے۔جو رائے عقل کے بجائے جذبات کی بنیاد پر قائم کی جائے وہ عقلی دلائل سے نہیں بدلتی۔ایسے لوگ ہر دلیل سن کر بھی لایعنی اعتراضات کرتے رہتے ہیں۔مثلاً یہ کہ تم تو اہل فارس کی پیروی کر رہے ہو وغیرہ۔بہر حال ہمارے کام دلیل کے ساتھ اپنی بات پیش کرنا ہے،لوگوں سے زبردستی اپنی بات منوانا نہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبور میں پیش گوئی

محترم قارئین!قرآن مجید میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کے متعدد دلائل بیان ہوئے ہیں۔ان میں سے ایک دلیل جو بار بار دہرائی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ پچھلے صحیفوں میں آپ کی آمد کی متعدد پیش گوئیاں بیان ہوئی ہیں اور بلاشبہ آپ ان صحیفوں میں بیان کردہ انبیا علیہم السلام کی پیش گوئیوں کا واحد مصداق ہیں۔

حضرت داودؑ اور حج بیت اللہ

مسلمان اہل علم پچھلی کتابوں کا مطالعہ کر کے ان پیش گوئیوں کی تفصیل بیان کرتے رہتے ہیں۔ان میں سے ایک پیش گوئی اس طرح بیان کی جاتی ہے جو انجیل میں حضرت عیسی علیہ السلام کے الفاظ میں کتاب متی(باب 21:42-44)میں اس طرح بیان ہوتی ہے۔

جس پتھر کو معماروں نے رد کیا
وہی کونے کے سرے کا پتھر ہو گیا
یہ خداوند کی طرف سے ہوا
اور ہماری نظر میں عجیب ہے۔

اس پیش گوئی کا پورا مطلب ہم مضمون کے آخر میں بیان کریں گے۔سر دست یہ بات سمجھ لیں کہ یہ پیش گوئی اصل میں حضرت عیسیٰ کی نہیں ہے۔بلکہ یہ پہلے ہی سے یہود کی کتب میں

لکھی ہوئی موجود تھی۔ چنانچہ اس پیش گوئی سے پہلے سیدنا مسیح یہودی علماء اور سرداروں سے فرماتے ہیں:

’’کیا تم نے کتاب مقدس میں کبھی نہیں پڑھا کہ جس پتھر کو معماروں نے رد کیا......‘‘

ان الفاظ سے صاف ظاہر ہے کہ یہ پیش گوئی کتاب مقدس میں حضرت عیسیٰ کے آنے سے پہلے ہی کر دی گئی تھی اور اس کی اہمیت کی بنا پر حضرت عیسیٰ نے اس کو نہ صرف دہرایا بلکہ اس کی وضاحت کرتے ہوئے اس میں اضافہ بھی کیا۔ یعنی اصل میں یہ آنجناب کی پیش گوئی نہیں بلکہ کسی اور ہستی کے الفاظ ہیں جنھیں آپ نے دہرایا اور مزید وضاحت کی ہے۔

قدیم صحف سماوی پر گہری نظر رکھنے والے یہ بات جانتے ہیں کہ یہ پیش گوئی دراصل حضرت داؤد علیہ السلام کی ہے اور یہ زبور میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے کی جانے والی اہم ترین پیش گوئی ہے۔ تاہم اس پیش گوئی کو جب انجیل سے لیا جاتا ہے تو اس میں استعمال ہونے والی تشبیہ و تمثیل یعنی پتھر اور کونے کا پتھر کی اصل معنویت کسی کو سمجھ میں نہیں آسکتیں جب تک کہ یہ حقیقت معلوم نہ ہو کہ یہ پیش گوئی حضرت داؤد نے حج ادا کرتے ہوئے حرم پاک کے سامنے کی تھی۔

حضرت داؤد کے حالات زندگی

قارئین کو شاید یہ بات کچھ عجیب لگے کہ حضرت داؤد نے حج کب ادا کیا لیکن ان کی اپنی کتاب تورات میں اللہ کی حمد کے جو مزمور (گیت) انھوں نے گائے ہیں نیز دیگر تاریخی حقائق بھی یہ واضح کرتے ہیں کہ حضرت داودؑ نے نہ صرف یہ سعادت حاصل کی تھی بلکہ اپنی یہ مشہور پیش گوئی بھی اسی وقت کی تھی۔ یہ پیش گوئی یہودیوں میں اتنی معروف تھی کہ سیدنا مسیح نے بغیر کسی خاص حوالے کے بے تکلف اسے ان کے سامنے بیان کر دیا۔

حضرت داؤد کے متعلق تاریخی طور پر مسلمانوں کو بہت کم معلومات حاصل ہیں۔ حالانکہ وہ سلسلہ نبوت و رسالت کے اہم ترین لوگوں میں سے ایک ہیں، زبور جیسی مشہور آسمانی کتاب ان پر اتری اور قرآن کریم میں جا بجا ان کا ذکر آیا ہے۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس پیش گوئی پر کچھ بات کرنے سے قبل کچھ حضرت داودؑ کا ذکر کر دیا جائے۔ اس کی ایک اور وجہ یہ ہے کہ ان کے حالات زندگی کو سمجھے بغیر یہ پیش گوئی سمجھ میں بھی نہیں آسکتی۔

سیدنا داؤد کا زمانہ ہزار قبل مسیح کا بیان کیا جاتا ہے۔ یعنی حضرت ابراہیم کے ایک ہزار برس بعد اور مسیح سے ہزار برس پہلے کا زمانہ۔ حضرت داؤد سے تقریباً پانچ سو برس (بعض روایات کے مطابق دو ڈھائی سو برس قبل) قبل حضرت موسیٰ کی زیر قیادت بنی اسرائیل کو فرعون سے نجات مل گئی تھی۔ آپ کے بعد بنی اسرائیل نے اپنے جانشین یوشع بن نون کی زیر قیادت فلسطین کو فتح کر لیا۔ مگر اس کے بعد انھوں نے ایک منظّم ریاست قائم نہیں کی۔ بنی اسرائیل مختلف ٹولیوں میں بٹ کر اس مفتوحہ علاقے میں بکھر گئے۔ اس کے بعد آنے والی صدیوں میں بنی اسرائیل اردگرد موجود مشرک قبائل کا اثر قبول کر کے مختلف انحرافات اور گمراہیوں کا شکار ہوتے چلے گئے۔ جس کے نتیجے میں بطور سزا اردگرد کی مشرک اقوام کو ان پر غلبہ دے دیا گیا۔ ان کا مقدس تابوت جسے تابوت سکینہ کہا جاتا تھا اور جو ان کے مذہبی اعمال کی ادائیگی میں مرکزی حیثیت رکھتا تھا وہ بھی ان سے چھین لیا گیا۔

یہی وہ زمانہ تھا جس میں حضرت داؤد کی پیدائش ہوئی۔ ایسے میں یہود نے اپنے پیغمبر شیموئل (یا سیموئل) سے درخواست کی کہ وہ اللہ سے دعا کریں کہ وہ ان کی قوم کے لیے ایک بادشاہ مقرر کر دے تاکہ اس کے تحت جنگ کر کے وہ مشرکین کے خلاف فتح حاصل کریں اور اپنا مقدس تابوت اور مفتوحہ علاقے واپس لے سکیں۔ قرآن مجید کی سورہ بقرہ میں اللہ تعالیٰ نے اس واقعے کو بیان کیا

ہے کہ بنی اسرائیل کے اصرار پر طالوت (ساؤل) کو ان کا بادشاہ بنایا گیا۔اور ان کی تقرری من جانب اللہ ہونے کی نشانی یہ مقرر کی گئی کہ ان کے دور میں تابوتِ سکینہ یہود کو واپس مل گیا۔ پھر ان کی زیر قیادت یہود نے جالوت کی مشرک فوج کو شکست دے کر فلسطین پر مکمل قبضہ کرلیا۔اس جنگ میں حضرت داؤد نے جالوت کو قتل کیا اور بادشاہ نے اپنی بیٹی کی شادی ان سے کردی۔

تاہم بعد میں ان کی مقبولیت اور بحیثیت ایک فوجی جرنل ان کی کامیابیوں سے بادشاہ ان سے خائف ہوگیا اور ان کی جان کے درپے ہوگیا۔ چنانچہ وہ جان بچانے کے لیے محل سے نکل گئے۔اس کے بعد بادشاہ کے ہرکارے ان کے تعاقب میں رہے اور وہ جان بچانے کے لیے جدوجہد کرتے رہے۔یہی وہ زمانہ ہے جس میں کی جانے والی مناجات اور حمدیہ گیتوں سے زبور کا آغاز ہوتا ہے۔ساؤل یعنی طالوت کی وفات کے بعد آپ فلسطین کے بادشاہ بنے اور آخرکار پورے فلسطین کو فتح کرکے اپنی سلطنت میں شامل کرلیا۔

حضرت داؤد کا سفر حجاز

جس زمانے میں حضرت داؤد ساؤل بادشاہ سے اپنی جان بچانے کے لیے بھاگ دوڑ کررہے تھے، ان کے سرپرست سیموئیل نبی کا انتقال ہوگیا۔اس کے بعد فلسطین ان کے لیے بالکل غیر محفوظ ہوگیا۔ چنانچہ یہی وہ دور ہے جس میں وہ فلسطین سے ہجرت کرکے دشت فاران تشریف لے گئے ،(کتاب سموئل 1:25)۔فاران کے نام سے بائبل میں دو علاقوں کا ذکر آیا ہے۔ایک مصر کے صحرائے سینا کا وہ علاقہ جس میں حضرت موسیٰ کی قوم فرعون کی غرقابی کے بعد پہنچی تھی۔دوسرے سرزمین عرب کا شہر مکہ جہاں خود بائبل کے مطابق حضرت ابراہیم نے حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل کو آباد کیا تھا،(کتاب پیدائش 21-17:21)۔ حضرت داؤد چونکہ فلسطین کے بادشاہ اور وہاں کی دیگر مشرک اقوام کی پہنچ سے دور نکلنا چاہتے تھے، اس لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ فلسطین کے

علاقے صحرائے سینا گئے ہوں۔ بلکہ قرین قیاس یہی ہے کہ وہ مکہ ہی تشریف لائے ہوں گے جو صحرا کے دور دراز سفر کی وجہ سے اہل فلسطین کی پہنچ سے دور ایک محفوظ پناہ گاہ تھی۔

یہی وہ وقت ہے جب آپ نے حج بیت اللہ ادا کیا۔اس روح پرور قیام کی یاد تازیست آپ کو اس طرح ستاتی رہی کہ بعد میں پورے فلسطین کا بادشاہ بننے کے بعد بھی آپ اسے یاد کرتے رہے اور زبور کا ایک پورا مزمور (زبور: 84) اسی سفر حج کی یادوں پر ہے جس میں وہ مکہ کا ذکر اس کے قدیم نام ''بکہ'' سے کرتے ہیں۔خیال رہے کہ قرآن مجید میں بھی یہود سے مکالمہ کرتے وقت اللہ تعالیٰ نے مکہ کو بکہ کے نام ہی سے بیان کیا ہے،(آل عمران 96:3)۔اس مزمور میں وہ یہ خواہش کرتے ہیں کہ وہ بادشاہ کے بجائے اللہ کے گھر کے دربان ہوتے۔یہ پوری تحقیق تمام تر تفصیلی دلائل کے ساتھ، جناب عبدالستار غوری کی کتاب ''اکلوتا فرزند ذبیح اسحاق یا اسماعیل'' میں پڑھی جاسکتی ہے۔

زبور میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش گوئی

تاہم جس پیش گوئی کا میں نے ذکر کیا ہے وہ زبور کے ایک دوسرے مزمور (زبور: 118) میں آئی ہے۔جہاں تک میں سمجھا ہوں یہ مزمور عین حالت حج میں کہا گیا ہے۔قارئین کی سہولت کے لیے اس مزمور کو پورا نقل کررہا ہوں۔کیونکہ اس سے نہ صرف پوری بات سمجھ میں آئے گی بلکہ یہ واضح کرنے میں بھی سہولت رہے گی کہ یہود و نصاریٰ اس پیش گوئی کا رخ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے موڑ کر کس طرح دوسروں کی طرف کردیتے ہیں۔ پھر اس سے یہ فائدہ بھی ہے کہ یہ مزمور ریکارڈ پر آجائے گا کیوں کہ یہود و نصاریٰ کا دستور ہے کہ وہ جب یہ دیکھتے ہیں کہ کسی مسلمان نے ان کی کتاب سے نبی عربی کی صداقت کا کوئی ثبوت پیش کردیا ہے تو وہ فوراً اس ترجمے کو متروک قرار دے کر ایک ایسا نیا ترجمہ کرتے ہیں جس میں اصل بات غائب کردی جاتی ہے۔

یہ مزمور نقل کرنے سے قبل یہ بھی واضح کر دوں کہ دیگر الہامی کتب کی طرح زبور بھی ترجمہ در ترجمہ کے عمل سے گزری ہے۔اس کے نتیجے میں اس میں اب وہ تاثیر محسوس نہیں ہوگی جو قرآن مجید نے بیان کی ہے کہ پہاڑ اور پرندے بھی حضرت داؤد کے ساتھ حمد و تسبیح کرتے تھے۔مگر بہر حال وہ معنویت موجود ہے جس کی بنا پر قرآن مجید نے بار باران کتابوں کا حوالہ دے کر یہ کہا تھا کہ ہمارے نبی کا تذکرہ تم ان کتابوں میں لکھا ہوا پاتے ہو،(اعراف 157:7)۔

حضرت داؤد کا مزمور

اس مزمور کے کئی حصے ہیں۔میں ذیل میں مزمور نقل کر رہا ہوں اور ساتھ ساتھ اہم باتوں کی وضاحت بھی کرتا جاؤں گا۔

خداوند کا شکر کرو کیونکہ وہ بھلا ہے
اور اس کی شفقت ابدی ہے
اسرائیل اب کہے
اس کی شفقت ابدی ہے
ہارون کا گھرانہ اب کہے
اس کی شفقت ابدی ہے
خداوند سے ڈرنے والے اب کہیں
اس کی شفقت ابدی ہے

یہ ابتدائی آیات یعنی 1 تا 4 اللہ کی حمد پر مشتمل ہیں۔جبکہ آخری آیت یعنی 29 میں بھی یہی حمد یہ مضمون دہرایا گیا ہے۔یہی حمد یہ انداز زبور کی وجہ شہرت بھی ہے۔پھر آیت 5 سے 18 تک وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ کس طرح ان کے دشمنوں نے ان کو گھیر لیا تھا اور فلسطین کی تمام قومیں ان

کے خلاف ہوگئی تھیں مگر انھوں نے اللہ سے مدد مانگی اور اسی پر بھروسہ رکھا تو اللہ نے انھیں ان دشمنوں سے نجات عطا فرمادی۔پھر وہ اپنے لیے اس مزمور میں ایک عظیم پیش گوئی کرتے ہیں کہ وہ اپنے تمام دشمنوں کو شکست دیں گے اور ان کو مارنے والوں کی تمام تر کوششوں کے برخلاف وہ زندہ رہیں گے اور اللہ کی حمد کرتے رہیں گے۔کس طرح وہ ایک سخت آزمائش سے تو گزرے مگر آخر کار اللہ نے انھیں بچالیا۔فرماتے ہیں:

میں نے مصیبت میں خداوند سے دعا کی
خداوند نے مجھے جواب دیا اور کشادگی بخشی
خداوند میری طرف ہے میں ڈرنے کا نہیں
انسان میرا کیا کر سکتا ہے؟
خداوند میری طرف میرے مددگاروں میں ہے
اس لیے میں اپنے عداوت رکھنے والوں کو دیکھ لوں گا
خداوند پر توکل رکھنا
انسان پر بھروسا رکھنے سے بہتر ہے
خداوند پر توکل رکھنا
امراء پر بھروسا رکھنے سے بہتر ہے
سب قوموں نے مجھے گھیر لیا
میں خداوند کے نام سے ان کو کاٹ ڈالوں گا
انہوں نے مجھے گھیر لیا۔ بیشک گھیر لیا
میں خداوند کے نام سے ان کو کاٹ ڈالوں گا
انہوں نے شہد کی مکھیوں کی طرح مجھے گھیر لیا

وہ کانٹوں کی آگ کی طرح بجھ گئے
میں خداوند کے نام سے ان کو کاٹ ڈالوں گا
تو نے مجھے زور سے دھکیل دیا کہ گر پڑوں
لیکن خداوند نے میری مدد کی
خداوند میری قوت اور میرا گیت ہے
وہی میری نجات ہوا
صادقوں کے خیموں میں شادمانی اور نجات کی راگنی ہے
خداوند کا داہنا ہاتھ دلاوری کرتا ہے
خداوند کا داہنا ہاتھ بلند ہوا ہے
خداوند کا داہنا ہاتھ دلاوری کرتا ہے
میں مروں گا نہیں بلکہ جیتا رہوں گا
اور خداوند کے کاموں کو بیان کروں گا
خداوند نے مجھے سخت تنبیہ تو کی ہے
لیکن موت کے حوالہ نہیں کیا

آیت 19 سے وہ سلسلہ کلام ہے جس میں وہ حرم میں داخل ہوتے ہوئے وہ مشہور پیش گوئی کرتے ہیں جس کا شروع میں ذکر ہوا۔ انداز سے صاف ظاہر ہے کہ اس سے قبل کی آیات وہ راستے میں پڑھ رہے تھے، مگر اب وہ حرم میں داخل ہو رہے ہیں اور حرم کو سامنے دیکھ کر اللہ تعالیٰ کو براہ راست مخاطب ہو کر گفتگو کر رہے ہیں۔ فرماتے ہیں:

صداقت کے پھاٹکوں کو میرے لیے کھول دو
میں ان سے داخل ہو کر خداوند کا شکر کروں گا

خداوند کا پھاٹک یہی ہے
صادق اس سے داخل ہوں گے
میں تیرا شکر کروں گا کیونکہ تو نے مجھے جواب دیا
اور خود میری نجات بنا ہے

اب اس کے بعد حرم کے سامنے کھڑے ہو کر حجر اسود کو دیکھ کر فرماتے ہیں۔ یہ وہی پیش گوئی ہے جس کا ذکر سیدنا مسیح نے کیا ہے۔

جس پتھر کو معماروں نے رد کیا
وہی کونے کے سرے کا پتھر ہو گیا
یہ خداوند کی طرف سے ہوا
اور ہماری نظر میں عجیب ہے
یہ وہی دن ہے جسے خداوند نے مقرر کیا
ہم اس میں شادمان ہوں گے اور خوشی منائیں گے
آہ! اے خداوند! بچا لے
آہ! اے خداوند! خوشحالی بخش

اس کے بعد سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کی پیش گوئی اس طرح کرتے ہیں:

مبارک ہے وہ جو خداوند کے نام سے آتا ہے
ہم نے تم کو خداوند کے گھر سے دعا دی ہے
یہوواہ ہی خدا ہے اور اسی نے ہم کو نور بخشا ہے
قربانی کو مذبح کے سینگوں سے رسیوں سے باندھو
تو میرا خدا ہے۔ میں تیرا شکر کروں گا

تو میرا خدا ہے۔ میں تیری تمجید کروں گا
خداوند کا شکر کرو کیونکہ وہ بھلا ہے
اور اس کی شفقت ابدی ہے

اوپر لکھے ہوئے الفاظ پر پھر غور کیجیے۔

مبارک ہے وہ جو خداوند کے نام سے آتا ہے،(آیت26)۔

ہر قرینہ اس بات کا گواہ ہے کہ آنے والی ہستی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہستی ہے۔ اور یہ الفاظ حرم مکہ میں ادا کیے جارہے ہیں۔ اس کا سب سے بنیادی قرینہ یہ ہے کہ حضرت داؤد کے زمانے میں ابھی ہیکل سلیمانی کی تعمیر نہیں ہوئی تھی۔ یہود کی کوئی مرکزی عبادت گاہ نہیں تھی۔ مگر دیکھیے کہ اس مزمور میں خداوند کا پھاٹک یہی ہے(آیت 20) اور ہم نے تم کو خداوند کے گھر سے دعا دی ہے،(آیت26) کے الفاظ آتے ہیں۔ خداوند کا گھر دراصل بیت اللہ کا ترجمہ ہے۔ حضرت داؤد کے زمانے میں بیت اللہ کہلانے والی عمارت دنیا کے نقشے پر ایک ہی تھی اور وہ حرم کعبہ تھا۔ مزید اس مزمور میں وہ قربانی اور قربان گاہ یعنی مذبح کا ذکر کرتے ہیں،(آیت 27)۔ کیا یہ بات مسلمانوں کو بتانے کی کوئی ضرورت ہے کہ حج کے موقع پر حرم مکہ میں قربان گاہ اور قربانی کا زیارت سے کیا تعلق ہوتا ہے؟

پھر جو پیش گوئی کونے کے پتھر کے تعلق سے بیان ہوئی ہے وہ واضح رہے کہ بنی اسماعیل کے حوالے سے ہے۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ آج اِس قوم کو دنیا نے فراموش اور رد کر رکھا ہے مگر کل یہ حرم پاک کے کونے کے پتھر یعنی حجر اسود کی طرح مقدس اور محترم ہو جائے گی۔ ہمیں یہ بات آج عجیب لگتی ہے، مگر یہ اللہ کا فیصلہ ہے۔ چنانچہ اس کے بعد وہ بنی اسماعیل کو عافیت اور خوشحالی کی دعا دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم نے تم کو خداوند کے گھر سے دعا دی ہے۔

تحریف وتاویل

یہود و نصاریٰ نے بڑی کوششیں کی ہیں کسی طرح اس پیش گوئی کا مصداق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ قرار پائیں۔ چنانچہ یہود نے اس معاملے میں یہ کام کیا کہ اس مزمور پر سے حضرت داؤد کا نام ہٹادیا(خیال رہے کہ موجودہ زبور میں بعض مزامیر بعد میں آنے والوں کے بھی ہیں)۔ غالبًا ان کا خیال تھا کہ نہ رہے گا بانس اور نہ بجے گی بانسری کے بمصداق جب حضرت داؤد کی نسبت ہی نہیں رہی تو یہ پیش گوئی اپنی اہمیت کھو بیٹھے گی۔ مگر اس پیش گوئی کو حضرت عیسیٰ نے انجیل میں دہرا کر اس کی اہمیت کو اتنا نمایاں کر دیا کہ ایسی کوئی کوشش اب موثر نہیں ہو سکتی۔

ایک دوسری تاویل یہ کی جاتی ہے کہ یہ حضرت داؤد کا کلام اس لیے نہیں ہو سکتا کہ اس میں بیت اللہ یا خداوند کے گھر اور قربانی اور قربان گاہ کا ذکر آیا ہے۔ جیسا کہ پیچھے بیان ہوا کہ ہیکل سلیمانی تو حضرت داؤد کے بعد حضرت سلیمان نے بنوایا تھا۔ چنانچہ ان لوگوں کے نزدیک یہ بات بالکل واضح ہے کہ ’’خداوند کے گھر‘‘ جیسے کسی الفاظ کا کوئی مسمیٰ حضرت داؤد کے زمانے میں موجود ہی نہیں تھا، اس نے ان آیات کی یہ تاویل کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ مزمور حضرت داؤد کا ہے ہی نہیں بلکہ اس زمانے کا ہے جب یہود بابل کی اسیری سے واپس یروشلم لوٹ رہے تھے۔ یعنی بخت نصر یروشلم کو تباہ کر کے انھیں ساتھ بابل لے گیا تھا تو کم وبیش ایک صدی کی غلامی کے بعد سائرس یا ذولقرنین نے انھیں اس غلامی سے نجات دلا کر دوبارہ یروشلم لوٹنے کی اجازت دی تھی۔ ایسے میں کسی نامعلوم شخص نے یروشلم میں داخل ہوتے وقت ہیکل سلیمانی کو دیکھ کر یہ مزمور پڑھا تھا۔

تاہم اس مزمور کا ابتدائی حصہ اس تاویل کی مکمل طور پر نفی کر دیتا ہے۔ جیسا کہ ہم نے پیچھے بیان کیا کہ حضرت داؤد بادشاہ وقت کے مسلسل عتاب کا نشانہ بنے رہے اور مستقل اپنی جان

بچانے کی جدوجہد کرتے رہے اور آخر کار اپنے تمام دشمنوں پر اللہ کی مدد سے غالب آئے۔اس کی پوری داستان بائبل میں موجود ہے۔اس مزمور میں یہی داستان بہت اختصار سے بیان ہوئی ہے۔اس داستان کا بابل سے لوٹنے والے لوگوں سے بالکل کوئی تعلق نہیں۔ وہ تو خود مغلوب ہوکر عراقیوں کی قید میں تھے جبکہ یہاں داؤد علیہ السلام یہ کھلی ہوئی پیش گوئی کررہے ہیں:

’’سب قوموں نے مجھے گھیر لیا۔ میں خداوند کے نام سے ان کو کاٹ ڈالوں گا۔انہوں نے مجھے گھیر لیا۔ بیشک گھیر لیا۔ میں خداوند کے نام سے ان کو کاٹ ڈالوں گا۔انہوں نے شہد کی مکھیوں کی طرح مجھے گھیر لیا۔وہ کانٹوں کی آگ کی طرح بجھ گئے۔ میں خداوند کے نام سے ان کو کاٹ ڈالوں گا۔‘‘،(آیت10-12)

یہ دشمنوں میں گھرے ہوئے شخص کی للکار ہے کہ آج میں بہت مشکل میں ہوں لیکن کل میں کس طرح ان دشمنوں کا صفایا کردوں گا۔ بنی اسرائیل کی پوری تاریخ میں کوئی دوسری شخصیت نہیں ہے جس کے خلاف اس طرح ساری قومیں اور قبائل اٹھ کھڑے ہوئے ہوں اور وہ تنہا اللہ کی مدد سے غالب آ گیا ہو۔اس لیے یہ مزمور پڑھنے والی شخصیت سوائے حضرت داؤد کے اور کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔

مسیحی حضرات کی تاویل

مسیحی حضرات اس کی وہی تاویل کرتے ہیں جو آسمانی صحائف میں موجود نبی کریم اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دیگر پیش گوئیوں کی کرتے ہیں۔یعنی ان کا مصداق حضرت عیسیٰ ہیں، نہ کہ نبی آخر الزماں۔لیکن اول تو یہی بات کہ یہ پیش گوئی حرم مکہ میں کی گئی ہے اس بات کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑتی کہ جس آنے والے کا ذکر ہے وہ نبی عربی کے علاوہ کوئی اور ہو۔مگر اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ انجیل میں اس پیش گوئی کو نقل کرنے کے بعد اس کی جو شرح خود مسیح نے کی ہے اس

کے مطابق ان کی اپنی زندگی اور ان کی قوم کسی طور پر اس پیش گوئی کا مصداق نہیں بن سکتیں۔مسیحی حضرات کہتے ہیں کہ اس پیش گوئی کا مصداق مسیح ہیں۔جبکہ اکا دکا وہ مسلمان اہل علم جنھوں نے اس پیش گوئی کو موضوع بنایا ہے یہ کہتے ہیں کہ اس سے مراد ہمارے نبی ہیں۔ میں یہ نقطہ نظر پیش کررہا ہوں کہ’’کونے کے پتھر‘‘ کا مصداق کوئی فرد نہیں بلکہ قوم ہے۔یہی بات حضرت داؤد نے زبور میں بیان کی تھی اور یہی چیز انجیل میں سیدنا مسیح نے بالکل کھول کر رکھ دی ہے۔تاہم اس کے لیے انجیل کے بیان کو سمجھنا ہوگا۔

انجیل کی کتاب متی باب21 کی آیت23 سے یہ واقعہ بیان ہونا شروع ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ ہیکل سلیمانی میں کھڑے ہوکر دعوت دے رہے تھے کہ یہود سردار اور کاہن ان کے اردگرد جمع ہو گئے اور ان پر اعتراض کرنے لگے کہ تم یہ کام کس اختیار کے تحت کررہے ہو۔اس پر حضرت عیسیٰ نے پہلے ان کے کفر پر ان کو تنبیہ کی اور پھر ایک تمثیل کی زبان میں انھیں بتایا کہ اللہ کا عذاب ان پر آیا چاہتا ہے اور اب انھیں فارغ کر کے ایک دوسری قوم کو یہ منصب دے دیا جائے گا۔اس کے بعد انھوں نے حضرت داؤد کی زیر بحث پیش گوئی بیان کی اور ساتھ میں خود اس کی شرح اس طرح کرتے ہوئے فرمایا:

اس لیے میں تم سے کہتا ہوں کہ خدا کی بادشاہی تم سے لے لی جائے گی اور اس قوم کو جو اس کے پھل لائے دے دی جائے گی۔اور جو اس پتھر پر گرے گا ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا لیکن جس پر وہ گرے گا اسے پیس ڈالے گا۔اور جب سردار کاہنوں اور فریسیوں نے اس کی تمثیلیں سنیں تو سمجھ گئے کہ ہمارے حق میں کہتا ہے۔اور وہ اسے پکڑنے کی کوشش میں تھے لیکن لوگوں سے ڈرتے تھے کیونکہ وہ اسے نبی جانتے تھے،(متی21:43-46)۔

حضرت عیسیٰ نے صاف واضح کردیا ہے کہ یہاں زیر بحث قوم ہے کوئی فرد نہیں۔یعنی بنی

اسرائیل کو اللہ تعالیٰ عذاب دے کر جب منصب امامت سے فارغ کر دیں گے تو وہ پتھر یعنی بنی اسماعیل جنھیں یہود بے وقعت سمجھتے تھے، کونے کے سرے کا پتھر ہو جائے گا۔ اب اگر یہ بات ذہن میں رہے کہ پیش گوئی کرنے والے نبی داؤد علیہ السلام حرم میں کھڑے ہوئے ہیں تو پھر کونے کے پتھر سے مراد حجر اسود ہی ہوسکتا ہے جو حرم کے ایک کونے کے سرے پر نصب اس کا اہم ترین حصہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بنی اسماعیل کی قوم جو ایک عام پتھر کی طرح غیر اہم تھی وہ عنقریب حجر اسود کی طرح دنیا میں سب سے زیادہ اہم ہو جائے گی۔ اور پھر مسیح اس کی شرح کرتے ہیں کہ اس قوم کو وہ غلبہ وقوت اور اقتدار ملے گا کہ یہ دنیا کی جس قوم سے ٹکرائے گی اسے پاش پاش کر ڈالے گی۔

کون نہیں جانتا کہ داؤد اور مسیح علیہما السلام کی یہ پیش گوئیاں کس طرح حرف بحرف درست ثابت ہوئی ہیں۔ وہ عرب جنھیں یہود حقارت سے اُمی کہتے تھے اور ساری دنیا جنھیں غیر متمدن سمجھتی تھی جب ایمان لے آئے تو انھوں نے کس طرح بقول حضرت داؤد کے، عجیب طریقے پر دنیا کی سپر پاور کے پرخچے اڑا دیے اور جو قوم ان سے ٹکرائی ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گئی۔ اس کے برعکس حضرت عیسیٰ کے اپنے پیروکاروں کا معاملہ یہ تھا کہ ابتدائی کئی صدیوں میں ان کے پیروکاروں پر بدترین ظلم وستم ہوتے رہے۔ وہ کسی قوم کو کیا پیستے، دوسری قومیں انھیں پیستی رہیں۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ یا ان کی قوم سرے سے اس پیش گوئی کا مصداق ہو ہی نہیں سکتے۔ مسیحی حضرات لاکھ زور لگالیں، خود سیدنا مسیح اس پیش گوئی کی جو شرح کر کے گئے ہیں وہ ان کی راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ بلاشبہ اس پیش گوئی کا مصداق اگر کوئی ہے تو سرکار دو عالم کی ہستی ہے اور آپ کی قوم یعنی صحابہ کرام ہیں۔ اللہ ان پر اپنی رحمتیں اور برکتیں نازل کرے اور ہمیں ان کے نقش قدم پر چلائے۔ آمین۔

ہم جنس پرستی

محترم قارئین! قدیم انسانی تاریخ میں جس سب سے بڑی گمراہی نے انسانیت کو اپنے شکنجے میں کسا وہ شرک تھا۔ ایک زمانے میں یہ گمراہی اتنی بڑھی کہ اس نے سماج اور ریاست دونوں کو اپنا ہمنوا بنالیا۔ تنہا ایک خدا کی عبادت کرنا، سماج سے کٹ کر اپنا مذاق بنا لینے کے مترادف تھا۔ مشرکین دنیا کی ہر ریاست پر قابض تھے اپنا دین شرک بالجبر لوگوں پر نافذ کرتے۔ اگر انبیا کی رہنمائی میں کوئی فرد یا گروہ شرک چھوڑ کر توحید کی راہ اختیار کرتا تو موت کی سزا پاتا۔

تاہم کروڑوں اربوں درود وسلام ہوں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اصحاب پر کہ ان کی بے پناہ قربانیوں نے شرک کی گمراہی اور اس کے ظلم سے ہمیں نجات دی اور قیامت تک کے لیے دین کے نام پر جبر اور اپنا خود ساختہ دین دوسروں پر ٹھونسنے کا دور ختم کر دیا۔

ایک نئی گمراہی

تاہم دور جدید میں ایک اور برائی اسی طرح عالمی طور پر ہر جگہ پھیل چکی ہے جس طرح زمانہ قدیم میں شرک عام ہوا تھا۔ یہ برائی جنسی بے راہ روی کی برائی ہے۔ دور جدید میں اب کم وبیش تمام متمدن دنیا میں یہ مان لیا گیا ہے کہ بدکاری کوئی برائی نہیں اور عفت کوئی اخلاقی قدر یا خوبی نہیں ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ ایک دن میں نہیں ہوا۔ اس کے پیچھے پچھلی کئی صدیوں کے علمی اور سماجی افکار اور صنعتی دور میں پیدا ہو جانے والا طرز معاشرت ہے۔ تاہم انفارمیشن ایج سے قبل عفت کی

موت مغربی سماج کا خاصہ تھی۔ مگر اب گلوبل ولیج اور انفارمیشن ایج کے زمانے میں یہ برائی اب ساری دنیا میں پھیل رہی ہے۔ مغربی تہذیب کے اثرات کے نتیجے میں دنیا کی دیگر اہم تہذیبیں یعنی چینی، ہندی، مسلم تہذیبیں بھی تیزی سے بدکاری کو بطور ایک قدر کے معاشرتی زندگی کا حصہ بنا رہی ہیں۔ یہ بظاہر اب نصف صدی ہی کی بات ہے کہ مغربی دنیا کی طرح باقی دنیا میں بھی زنا عام ہو جائے گا اور عفت وعصمت کا تصور اسی طرح اجنبی ہو جائے گا جس طرح زمانہ قدیم میں توحید کا تصور ہو چکا تھا۔

جنسی بے راہ روی کے اس سیلاب کے کئی دھارے ہیں۔ اس کا ایک نیا دھارا جسے مغرب میں بھی حال ہی میں سماجی اور قانونی قبولیت حاصل ہوئی ہے ہم جنس پرستی ہے۔ پہلے یورپ اور اب نارتھ امریکہ میں بھی ہم جنس پرستی کو سماجی اور قانونی سطح پر قبول کرلیا گیا ہے۔ گرچہ آج بھی اس کی مخالفت کئی حلقوں کی طرف سے کی جاتی ہے، مگر یہ تنقید اور مخالفت پوری طرح موثر نہیں رہی ہے۔

پوسٹ ماڈرن ازم

انسانی سماج کبھی کسی برائی کو آسانی سے قبول نہیں کرتے۔ اس کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ فکری طور پر اس کے حق میں فضا ہموار ہو۔ ہم جنس پرستی کی سماجی اور قانونی سطح پر قبولیت کی اصل وجہ پوسٹ ماڈرن ازم کے وہ افکار ہیں جن کے مطابق انسانی جذبات اور خواہشات کو عقلی تصورات پر فوقیت حاصل ہو چکی ہے اور انسانی اقدار کی قدر و قیمت اضافی قرار دے دی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب اقدار اور معقولیت جیسی چیزیں اپنی قدر کھو دیتی ہیں تو پھر معاشرے میں ہر قسم کے انحراف کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ یہی ہم جنس پرستی کے معاملے میں ہوا ہے۔

جدید دنیا میں اب یہ مان لیا گیا ہے کہ افراد اپنی ذاتی زندگی میں باہمی رضامندی سے جو کرنا چاہیں کر سکتے ہیں۔ چنانچہ اس کے بعد کوئی قانونی رکاوٹ نہیں ڈالی جا سکتی۔ رہا سماج تو اس سے

نمٹنے کے لیے یہ استدلال تخلیق کیا گیا ہے کہ بہت سے افراد کے لیے یہ کوئی انحراف نہیں ہوتا بلکہ ان کی جینیاتی اور نفسیاتی ساخت کی بنا پر یہ ان کے لیے عین فطری طریقہ ہے۔

مخالفین کے استدلال کی ناکامی

مغرب میں اتنی آسانی سے اس فعل کو قبول عام حاصل نہیں ہوا ہے۔ روایتی اور مذہبی حلقوں کی طرف سے اس میں بڑی مزاحمت ہوئی ہے۔ لیکن آخر کار ان کے استدلال کو شکست ہوئی۔ مذہبی استدلال سے مراد یہ ہے کہ مذہبی کتابوں اور مذہبی قانون میں اسے ہمیشہ ایک بہت بڑا جرم سمجھا گیا ہے۔ قوم لوط کا واقعہ چونکہ بائبل کی ابتدا ہی میں بیان ہوا ہے اور یہود و نصاریٰ کی مذہبی روایت میں ہم جنس پرستی کو ایک بڑا جرم سمجھا جاتا تھا اس لیے اس کا گناہ ہونا ایک مسلمہ تھا۔ تاہم اہل مذہب کی اپنی انتہا پسندی کی وجہ سے مذہبی اعتقادات اور معیارات کو مغرب میں بہت پہلے ہی شکست ہو چکی تھی۔ اس لیے جب اس بنیاد پر ہم جنس پرستی کی مخالفت کی گئی تو اس کی کوئی خاص شنوائی نہیں ہوئی۔

مغربی سماج میں اصل رکاوٹ فطری استدلال تھا۔ یعنی انسانی فطرت اس چیز کو قبول نہیں کرتی اور اسے ہر حال میں ایک انحراف خیال کرتی ہے۔ پھر انسان کے سامنے جنسی تعلق کی اصل بنیاد یعنی مرد وعورت کا نکاح کے ذریعے اپنے جذبات کی تسکین کا راستہ اس قدر واضح طور پر کھلا ہوا ہے کہ عام حالات میں لوگ خود ہی ایسے انحرافات سے دور رہتے ہیں۔ مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ جن معاشروں میں مرد وزن کو ہر طرح کی جنسی آزادی بے روک وٹوک دے دی جائے تو وہاں یہ انحراف خود بخود جگہ پالیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کا جنسی جذبہ لامحدود طور پر طاقتور ہے۔ جبکہ اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا تکمیل لذت کے لیے نہیں بلکہ تعارف لذت کے اصول پر بنائی ہے۔ چنانچہ مذہب نے نکاح کے قانون اور دیگر کئی ذرائع سے انسانوں کے اس جذبے پر

پابندیاں لگا کر ان کی یہ تربیت کی ہے کہ وہ اسے خود پر سوار نہ ہونے دیں۔

مگر جن معاشروں میں جنسی جذبہ کو ہر طرح کی پابندیوں سے آزاد کر دیا جائے تو اس کے نتیجے میں پھر انحرافات جنم لیتے ہیں۔ تکمیل لذت کی خواہش میں انسان اندھا ہو کر ہر بند دروازہ کھولنے کی کوشش کرتا ہے۔ ہم جنس پرستی بھی ایسا ہی ایک بند دروازہ ہے جسے کھولنا بہت سے لوگوں کے لیے ایک چیلنج بن جاتا ہے۔ یہی مغرب میں بھی ہوا۔ وہاں لوگوں نے تکمیل لذت کی خاطر اس بند دروازے کو بھی کھول ڈالا۔

تاہم پھر فطرت سے لڑنے کے لیے انھیں اس کی اخلاقی اور عقلی توجیہ کرنی پڑی۔ وہ توجیہ یہ تھی کہ بہت سے لوگوں کے لیے اپنی جینیاتی اور نفسیاتی ساخت کی بنا ہم جنس پرستی ہی عین فطرت ہے اور یہ کسی قسم کی کوئی بیماری یا انحراف نہیں۔ مزید یہ کہ معاشرے کو یہ باور کرایا گیا کہ اگر اسے سماجی سطح پر کوئی برائی سمجھا گیا تو اس کا بہت برا اثر ان لوگوں کی نفسیات پر پڑے گا۔ سب سے بڑا اور مضبوط استدلال یہ کیا گیا کہ ہم جنس پرستی بعض جینیاتی وجوہات کی بنا پر کچھ لوگوں کے لیے عین فطرت ہے۔ یہ اگر ان کی فطرت ہے تو انھیں اس سے ہٹانا ان پر بدترین ظلم ہے۔ پھر مزید یہ بھی بار بار بیان کیا گیا کہ ہم جنس پرست دوسروں سے زیادہ اچھے انسان، قانون پسند، پرامن شہری ہوتے ہیں۔ یہ تمام چیزیں اس تواتر کے ساتھ دہرائی جاتی رہیں کہ آخر کار مغربی سماج قانون اور اقدار کی سطح پر یہ مان لیا کہ ہم جنس پرستی ایک نارمل رویہ ہے۔ چنانچہ 1990 میں ولڈ ہیلتھ آرگنائزیشن (WHO) نے اسے ذہنی امراض کی فہرست سے نکال دیا۔ جس کے بعد ایک ایک کر کے تمام مغربی ممالک، جنوبی امریکہ ممالک، کینیڈا اور امریکہ میں انفرادی ریاستیں ہم جنس شادی کو باقاعدہ قانونی قبولیت دیتے چلے جا رہے ہیں۔

ہم جنس پرستی کے خلاف ہمارا مقدمہ

زنا کی طرح ہم جنس پرستی بھی مشرقی اور اسلامی معاشروں میں اجنبی نہ تھی۔ صرف اسے عقلی اور اخلاقی جواز حاصل نہ تھا۔ تاہم اب انٹرنیٹ کے ذریعے اس کے جواز پر مبنی لٹریچر چونکہ عام ہو چکا ہے اس لیے ہمارے ہاں اسے تیزی سے فروغ مل رہا ہے۔ اس مسئلے کا حل یہ نہیں کہ اس چیز کے خلاف نفرت آمیز گفتگو کی جائے بلکہ ضروری ہے کہ ہم استدلال کی سطح پر مذہب کا مقدمہ لوگوں کے سامنے رکھیں۔

اس سلسلے کی پہلی گزارش یہ ہے کہ ہم جنس پرستی کے حق میں جینیاتی اور نفسیاتی بنیادوں پر یہ استدلال کرنا کہ یہ کچھ لوگوں کے لیے عین فطری رویہ ہے، ہر اعتبار سے ایک غلط فہمی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانی وجود میں ابھی تک کوئی ایسا جین دریافت نہیں ہوا جو یہ طے کرتا ہے کہ کسی شخص کے جنسی رجحانات کیا ہوں گے۔

کیا یہ جینز کا مسئلہ ہے؟

اس معاملے میں مغرب میں ابھی تک کسی gay gene کی تلاش پر بحثیں اور تحقیق جاری ہے۔ جو چیز ابھی مرحلہ تحقیق پر ہو اور اس کے بارے میں متضاد باتیں سامنے آ رہی ہوں اس کی بنیاد پر کسی چیز کو عین فطرت قرار دے دینا کس طرح درست ہو سکتا ہے۔ مزید یہ کہ یہ ایک مسلمہ علمی اور سائنسی حقیقت ہے کہ جنسی رجحانات صرف جینز ہی سے طے نہیں ہوتے۔ بلکہ اس کے ساتھ انسانی جسم میں کام کرنے والے ہارمون، انسانی کی ابتدائی تربیت و حالات اور سماجی اثرات کا بھی بہت اثر ہوتا ہے۔ اس لیے صرف جینز کو اس کا ذمہ دار ٹھہرانا ویسے ہی درست نہیں ہے۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ انسانی فطرت یہ ہے کہ وہ تربیت کی بنیاد پر اپنے بنیادی نفسیاتی رجحانات بشمول جنسی رجحانات کو بھی طے کر لیتی ہے۔ اس کی ایک بہت سادہ اور عام مثال یہ ہے کہ عام لوگ اجنبی خواتین کے برعکس اپنی محرمات میں کوئی جنسی کشش محسوس نہیں کرتے۔ یہ کوئی فطرت نہیں ہے بلکہ یہ تربیت اور

ماحول کا اثر ہوتا ہے جو کسی عام مرد کے جنسی رجحان کا رخ اس کی اپنی ماں، بہن یا بیٹی کی طرف سے ہٹا دیتا ہے۔ حالانکہ ان کے جینز میں تو سرتا سر عورت کی کشش موجود ہوتی ہے۔ اس سے معلوم یہ ہوا کہ تربیت اور ماحول کے اثرات جینز پر بھی غالب رہتے ہیں۔ اس لیے جب تک کوئی شخص نفسیاتی طور پر، کسی بھی وجہ سے، ہم جنسی پرستی میں ملوث ہونے کے لیے تیار نہ ہو اس کے جینز اسے زبردستی ہم جنس پرستی میں مبتلا نہیں کر سکتے نہ اسے اس کی فطرت بنا سکتے ہیں۔ ہاں وہ خود نفسیاتی طور پر اس کے لیے تیار ہو جائے تو پھر جینز کچھ بھی کہتے رہیں، آدمی یہ کر کے ہی دم لیتا ہے۔

چنانچہ یہ فطرت والی بات بس ہوائی ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے ارتقا کے حامی اخبارات و رسائل میں ہر ہفتے ادھر اُدھر کی کوئی نہ کوئی چیز شائع ہوتی رہتی ہے۔ ایسی چیزیں کسی شخص کو اپنے نقطہ نظر پر اعتماد تو دے سکتی ہیں، مگر علم کی دنیا میں اسے کسی مسلمے کے طور پر پیش نہیں کیا جا سکتا۔

انسان کا حیوانی وجود

جو لوگ جنیاتی اور فطری بنیادوں پر ہم جنس پرستی کے حق میں دلائل دیتے ہیں وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو کس خلقت پر پیدا کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو جینز کے ساتھ ایک جسم بھی دیا ہے۔ مرد و زن کے مختلف جینز ان کے جسم کو ایک خاص جسمانی ساخت دیتے ہیں۔ اس مختلف حیوانی ساخت میں یہ جینز اور مرد و زن کا حیوانی وجود پکار پکار کر یہ بتاتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے لیے بنا ہے۔ ظاہر ہے کہ حیا مانع ہے کہ اس حقیقت کی تفصیل بیان کی جائے مگر انسان جانتا اور سمجھ سکتا ہے کہ مرد کا جسم مرد کے لیے اور عورت کا جسم عورت کے لیے نہیں بنایا گیا۔ صنف مخالف ایک دوسرے کے لیے بنائے گئے ہیں۔ یہ ایک دوسرے میں فطری اور ہمہ وقت کشش محسوس کرتے ہیں۔ جب یہ نکاح کے تعلق سے ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو بڑے فطری طریقے سے اولاد کی داغ بیل پڑتی ہے۔ اس کے بعد عورت کا پورا انسانی وجود

بچوں کی تخلیق اور پرورش کی فیکٹری بن جاتا ہے۔ وہ اسے اپنے اندر پروان چڑھاتی، جنم دیتی، اپنے اندر سے اس کی غذا کا بندوبست کرتی اور اس ننھی کونپل کو اپنے نرم ہوا سے زیادہ لطیف وجود سے جلا بخشتی ہے۔ یہ فطرت ہے۔ یہی عین فطرت ہے۔ پتہ نہیں وہ کون لوگ ہیں جو اس کے علاوہ کہیں اور سے فطرت اور جینز کو ڈھونڈنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ انسانی جینز مرد و زن کے اعضا اور انسانی فطرت مرد و زن کے مزاج میں چیخ چیخ کر بتا رہی ہے کہ سیدھا راستہ یہاں ہے۔ فطرت کے اس سیدھے راستے کو چھوڑ کر کہیں اور جانے والے لوگ انحراف ہی کا شکار ہوتے ہیں۔ خالق فطرت نے جب اس حوالے سے انسانوں کو اپنی منشا سے براہ راست آگاہ کرنا چاہا تو اپنے جلیل القدر پیغمبر حضرت لوط علیہ السلام کی زبانی کلام کیا۔ ان کی قوم اس فعل بد میں ذوق و شوق سے مبتلا تھی۔ چنانچہ ان کے اس جاہلانہ فعل سے انھوں نے اس طرح اظہار براءت کیا:

’’کیا تم لوگ عورتوں کو چھوڑ کر مردوں سے شہوت رانی کرتے ہو! بلکہ تم بڑے ہی جاہل ہو!؛‘‘ (النمل 55:27)

یہ آیت اس ضمن میں پیدا ہونے والی ایک اور غلط فہمی کو رفع کرتی ہے۔ وہ غلط فہمی یہ ہے کہ اللہ کے نزدیک قوم لوط کا اصل جرم ہم جنس پرستی نہیں بلکہ اس فعل بد پر جبر تھا۔ یہ استدلال اس واقعے سے کیا جاتا ہے جس کے مطابق حضرت لوط کے ہاں فرشتے نوجوان لڑکوں کی شکل میں آئے تو یہ لوگ ان کو زبردستی حضرت لوط کے مکان سے نکالنے کے لیے آ گئے۔ لیکن یہ آیت حضرت لوط کی زبانی یہ واضح کر رہی ہے ان کا اصل جرم اپنی عورتوں کے بجائے مردوں سے شہوت رانی کرنا تھا۔ یہی بات ایک دوسری جگہ یوں بیان کی گئی ہے۔

’’کیا تم خلق میں سے مردوں سے شہوت رانی کرتے ہو۔ اور تمہارے رب نے تمہارے لیے جو بیویاں پیدا کی ہیں ان کو چھوڑتے ہو۔ بلکہ تم لوگ نہایت ہی حد سے

گزر جانے والے لوگ ہو۔ وہ بولے کہ اے لوط! اگر تم باز نہ آئے تو تم لازماً یہاں سے نکال چھوڑے جاؤ گے۔ اس نے کہا، میں تمہارے اس عمل سے سخت بیزار ہوں۔ اے رب! تو مجھے اور میرے اہل کو ان کے عمل کے انجام سے نجات دے۔''، (الشعراء 25:165-169)

فرشتوں والا واقعہ اتمام حجت کے لیے پیش آیا۔ اس لیے کہ رسولوں کے باب میں اللہ کا یہ قانون ہے کہ اتمام حجت کے بعد بھی وہ کسی قوم پر ہاتھ اسی وقت ڈالتے ہیں جب قوم رسول پر چڑھائی کردے۔ یہ براہ راست اللہ تعالیٰ پر حملہ کرنے کے مترادف ہوتا ہے اور نتیجے کے طور پر فوراً اس قوم کو ختم کر دیا جاتا ہے۔ یہی قوم لوط کے ساتھ ہوا کہ انھوں نے لڑکے نظر آنے والے فرشتوں کی خواہش میں حضرت لوط کے گھر پر چڑھائی کی اور جواب میں عذاب آ گیا۔

مذہبی استدلال: ''قطع سبیل''

مذہب اس معاملے میں بالکل واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہم جنس تعلق ایک بہت بڑا جرم اور فطرت کے خلاف ایک جنگ ہے۔ قران مجید اسے قوم لوط ہی کے حوالے سے ''قطع سبیل''، یعنی فطرت کی راہ کاٹنے (العنکبوت 29:29) سے تعبیر کرتا ہے۔ یہ کس طرح فطرت کی راہ کاٹتا ہے اس کے لیے انسانی سماج کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

انسانی سماج ایک اجتماعیت پسند سماج ہے۔ یہ اجتماعیت تعلقات سے وجود میں آتی ہے۔ تعلقات دو طرح کے ہوتے ہیں۔ پہلا عارضی تعلق جو بہت بڑے دائرے میں پھیلا ہوا ہے اور کم وبیش پورے سماج کا احاطہ کرتا ہے۔ یہ تعلق ضرورت، مفاد، ذوق، نظریات اور جذبات واحسات وغیرہ کی بنیاد پر وجود میں آتا ہے۔ دکاندار اور گاہک کا تعلق ضرورت کا ہے۔ باس اور ملازم کا تعلق مفاد کا ہے۔ دوستی ذوق اور مزاج سے پھوٹی ہے۔ سیاسی اور مذہبی جماعتوں میں لوگ

نظریات کی بنیاد پر ایک تعلق پیدا کرتے ہیں۔ کسی انسان سے محبت کا تعلق جذبات واحساسات کی پیداوار ہوتا ہے۔

انسانی سماج انھی عارضی تعلقات سے عبارت ہے۔ مگر ان تعلقات کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے ضرورت، مفاد، ذوق، نظریات اور جذبات کسی وقت بھی بدل سکتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں تعلق ختم ہوجاتا یا کسی اور کے ساتھ جڑ جاتا ہے۔ ضرورت اور مفاد کو تو چھوڑیے لوگ ذوق، نظریہ اور جذباتی تعلق کو بھی ایسے بھولتے ہیں کہ کبھی یاد نہیں آتا۔

کیا لوگ تھے کہ جان سے بڑھ کر عزیز تھے
اب دل سے نام محو بھی اکثر کے ہو گئے

جبکہ انسان کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ ایک نفسیاتی وجود ہے۔ اسے اپنی تشکیل، تربیت اور تکمیل کے لیے کوئی ایسا تعلق چاہیے جو مستقل ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے مرد وعورت کے جنسی تعلق کو بنیاد بنایا ہے۔ اس تعلق کی پہلی خوبی یہ ہے کہ اس سے انسان وجود میں آتے ہیں۔ دنیا میں کوئی اور تعلق انسانوں کو وجود میں نہیں لاسکتا۔ ظاہر ہے کہ نسل انسانی کا باقی رہنا انسانیت کا سب سے بڑا اور بنیادی مسئلہ ہے۔ مرد وعورت کا جنسی تعلق سب سے پہلے اسی بنیادی انسانی ضرورت کو پورا کرتا ہے۔

اس تعلق کی دوسری خوبی یہ ہے کہ اس سے وہ رشتے پیدا ہوتے ہیں جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے مستقل ہوتے ہیں۔ پیدا ہونے والے بچے کی ماں اور اس کا باپ بہر حال اس کی موت تک ایک ہی رہتا ہے۔ یہی حیثیت بہن، بھائی اور دیگر تمام رشتہ داروں کی ہے کہ ان سے تعلق مستقل ہوتا ہے۔ یہی وہ رشتے ہیں جو بچپن کے عجز، بڑھاپے کے ضعف، بیماری کی مشقت محتاجی کی ضرورت میں فطری طور پر ہمیشہ اور ہر حال میں انسان کی مدد کو آتے ہیں۔

یہی قریبی رشتے ہیں جو اپنا وقت، محنت، پیسہ قربان کر کے انسان کے بچپن کی ناتوانی کو جوانی کی قوت دیتے ہیں۔ پھر یہی وہ رشتے ہیں جو ہر سرد و گرم میں انسان کا ذہنی، نفسیاتی، مالی اور جسمانی طور پر ساتھ دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ بڑھاپے کی ناتوانی کو اپنے بازوؤں سے سہارا دیتے اور موت کے بعد اپنے کندھوں پر اٹھا کر آخری سفر پر روانہ کرتے ہیں۔

ہم جنس پرستی اصل میں انھی بنیادی انسانی رشتوں کی جو مرد و عورت کے جنسی تعلق سے پیدا ہوتے ہیں، جڑ کاٹ دیتی ہے۔ ایک ہم جنس پرست جوڑا کبھی اولاد جنم نہیں دے سکتا۔ یہ کام صرف میاں بیوی کر سکتے ہیں۔ پانچ سات سال بعد میاں بیوی کا دل اگر ایک دوسرے سے بھر بھی جائے تب بھی وہ اولاد کی خاطر ساتھ رہتے اور ان کی پرورش کی ساری ذمہ داریاں اٹھاتے ہیں۔ جبکہ ہم جنس پرستی کوئی رشتہ نہیں بس ایک عارضی تعلق ہے۔ جس روز دل بھرا، ذوق بدلا، جذبہ ٹھنڈا ہوا، احساس ختم ہوا، یہ تعلق ختم۔ اس کے بعد کیا ہوا۔ نئے ہم مشرب کی تلاش۔ مگر جنس کا جذبہ تو زیادہ وقت نہیں گزرے گا ٹھنڈا پڑ جائے گا۔ اس کے بعد تلاش کس بنیاد پر ہوگی؟ یہ وہ سوال ہے جس کا جواب ہم جنس پرستی کے کسی حامی کے پاس نہیں ہے۔

انسانوں کے ساتھ ظلم

ہم جنس پرستی دراصل خاندان کے خاتمے کا نام ہے۔ خاندان ایک مرد و عورت کے جنسی تعلق کے نتیجے میں وجود میں آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جنسی تعلق میں اس قدر طاقت ہی اس لیے رکھی ہے کہ وہ اس کے ذریعے سے انسانوں کو مجبور کر دیتے ہیں کہ وہ اولاد کو جنم دیں اور پھر اس کا بوجھ اٹھائیں۔ مگر بدقسمتی سے مغرب کی جنسی آزادی کے تصور نے خاندان کو بہت کمزور کر دیا ہے۔ مرد و عورت کا تعلق جو صرف جنسی کشش کی بنیاد پر قائم ہو وہ بہت کمزور ہوتا ہے۔ یہ بار بار ٹوٹتا ہے۔ ایسے میں کہیں اولاد ہو جائے تو سب سے زیادہ اسی کے لیے مشکل ہو جاتی ہے۔

اولاد کا مقدر یہی ہوتا ہے کہ ماں کہیں ہو اور باپ کہیں اور۔ یوں بچہ ماں یا باپ یا بعض اوقات دونوں کے لمس اور تربیت سے محروم رہ جاتا ہے۔ ہم جنس پرست جوڑے یہ ستم ایک اور طرح ڈھاتے ہیں۔ وہ اولاد کی خواہش پوری کرنے کے لیے بچہ گود لے لیتے ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ اسے ماں کے لطیف لمس سے کون روشناس کرائے گا۔ اگر جوڑا خواتین کا ہے تو باپ کی نگہبانی کا احساس کون دلائے گا۔ ایک دوسرے سے دل بھر گیا تو لے پالک اولاد کا کیا ہوگا۔

چنانچہ ایسے تمام بچے شدید قسم کے نفسیاتی مسائل سے دوچار رہتے ہیں۔ لیکن مغرب میں یہ سسٹم برا بھلا اس لیے چل رہا ہے کہ وہاں بچوں کی معاشی ذمہ داری اور اسی طرح بزرگوں کی ذمہ داری بھی اسٹیٹ نے لے رکھی ہے۔ معاشی فراخی کی بنا پر آج یہ ان کے لیے کرنا آسان ہے۔ مگر جب کبھی معاشی زوال آیا تو پھر خاندان کے سوا انسان کی جائے پناہ کوئی نہیں رہے گی۔ یہ صرف خاندان ہوتا ہے جو ہر طرح کے حالات اور ماحول میں ہزاروں برس سے کمزور بچوں اور ناتواں بوڑھوں اور غریب و پریشان حال رشتہ داروں کو سنبھالتا آیا ہے۔ چنانچہ یہ بالکل واضح ہے کہ ہم جنس پرستی تعلق نسل انسانی اور خاندان دونوں کی جڑ کاٹ ڈالنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اسی کو قرآن مجید ''قطع سبیل'' یعنی فطرت کی راہ مارنے سے تعبیر کرتا ہے۔

پاکستان اور ہم جنس پرستی

دنیا بھر کی طرح پاکستان میں بھی ہم جنس پرستی کے رجحانات عام ہیں۔ ہمارا نقطہ نظر یہ ہے کہ یہ سرتاسر ایک نفسیاتی مسئلہ ہے۔ یہ زیادہ تر بچوں کی ابتدائی تربیت کی خرابی، غلط ماحول اور بعض اوقات والدین کی بے توجہی اور بے رحمانہ سلوک پیدا ہوتا ہے۔ بدقسمتی سے پاکستان میں جس طرح کے حالات ہیں، والدین بچوں کی تربیت سے جس طرح بے پروا ہیں، بچوں پر تشدد عام ہے، اس میں دیگر نفسیاتی انحرافات کی طرح ہم جنس پرستی کے پھیلنے کے بڑے روشن

امکانات ہیں۔اس پر مزید مغربی اور انڈین میڈیا نیز انٹرنیٹ سے جنسی بے راہ روی کی پیہم یلغار ہے۔اوراب اس سے آگے بڑھ کر ہم جنس پرستی کے حق میں کیے گئے پروپیگنڈے کا انٹرنیٹ کے ذریعے سے با آسانی پہنچنا ایک بڑا مسئلہ ہے۔جس میں متاثرہ شخص اس مسئلے کو نفسیاتی مسئلہ سمجھنے کے بجائے اپنی فطرت سمجھنے لگتا ہے۔

اب یہ بات معلوم ہے کہ پاکستانی نوجوان لڑکے اور لڑکیوں میں یہ مسئلہ بہت پھیل رہا ہے۔ ایسے میں یہ ضروری ہے کہ والدین اس مسئلے کو سنجیدگی سے لیں۔بچوں کی تربیت کی طرف خصوصی توجہ دیں۔تشدد اور بے اعتنائی سے پرہیز کریں۔اس بات کا خیال رکھیں کہ بچپن اور نوعمری میں بچے کے جنسی رجحانات اپنا ظہور کرتے ہیں۔اس میں وہ مرد و زن کی تمیز نہیں کرتے۔کہیں کوئی انحراف محسوس ہو تو یہ واضح کر دیں کہ محبت اور جنسی تعلق اصل میں ہمیشہ صنف مخالف کے ساتھ قائم ہوتا ہے۔یہی فطرت ہے۔

ایسا کوئی انحراف سامنے آئے تو نفرت اور غصہ کے بجائے ہمدردی کے ساتھ مسئلے کو حل کرنا چاہیے۔پختہ عمر کے عیش پرستوں کو چھوڑ کر نوعمر بچوں کے لیے یہ دراصل ایک نفسیاتی مسئلہ ہے۔ اس معاملے میں مذہب کی رہنمائی کو ہمیشہ سامنے رکھنا چاہیے۔قرآن مجید نے چونکہ قوم لوط کے حوالے سے اس معاملے میں اللہ رب العزت کی منشا،مزاج اور مرضی کو پوری طرح واضح کیا ہے۔اس لیے بچوں کو اس حوالے سے ایجوکیٹ کرنا چاہیے۔یہ سب سے بڑھ کر والدین کی ذمہ داری ہے۔

بہر حال اس پوری گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ ہم جنسی تعلق قطعاً ایک غیر فطری تعلق ہے۔یہ تعلق اگر فروغ پائے گا تو سماج کی جڑ کاٹ کر رکھ دے گا۔اس لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے ہاں درست شعور کو عام کریں اور دین کی تعلیم صحیح پس منظر میں دیں۔

تاریخ اور ختم نبوت

آج کے اس کالم میں میرے پیش نظر ختم نبوت کا ایک اہم پہلو سامنے لانا ہے۔ یہ وہ پہلو ہے جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے اہم ترین ہے،مگر ہمارے ہاں کبھی زیر بحث نہیں آتا۔ بلکہ سچی بات یہ ہے کہ جس طرح یہ چیزیں زیر بحث آتی ہیں،وہاں دین کے بنیادی ماخذ بہت کمزور جگہ پر نظر آتے ہیں اور مستشرقین ان کی سند اور صداقت دونوں پر زبردست سوالیہ نشان اٹھا دیتے ہیں۔اس انفارمیشن ایج میں جب گھر گھر انٹرنیٹ ہے اور وہ تمام تنقیدی مواد جس میں اسلام کی حقانیت پر سوالات اٹھائے ہیں چند بٹن دبا کر سامنے آجاتا ہے،ایسے میں ضروری ہے کہ اسلام کی حقانیت اور سچائی کا اثبات ان مسلمہ علمی بنیادوں پر کیا جائے جن کو دنیا مانتی ہے۔

الحمدللہ اللہ تعالیٰ نے یہ بڑی مہربانی کی ہے کہ دین اسلام کو ختم نبوت کے بعد اس طرح محفوظ کیا ہے کہ قیامت تک اس حوالے سے کوئی سوال علمی بنیادوں پر اٹھانا ممکن نہیں ہے۔اس کا تعلق چونکہ تاریخ سے ہے اس لیے پہلے تاریخ کے علم کے حوالے سے کچھ بنیادی مقدمات کو واضح کرنا ضروری ہے۔

تاریخ کا علم

تاریخ قوموں کا حافظہ ہوتی ہے جو اکثر ان کی موت کے ساتھ ہی ختم ہوتا ہے۔تاہم قومیں اور گروہ مردہ ہو جائیں تب بھی ان کی تاریخ غیر مستند داستانوں اور مزید بگڑ کر دیومالائی کہانیوں کی

شکل میں انسانیت کو منتقل ہوتی رہی ہے۔ جس طرح فرد اپنے حافظے کے سہارے اپنی ذات اور اپنے ماحول کو سمجھتا ہے اسی طرح قومیں اپنے وجود کو ہمیشہ اپنی تاریخ سے سمجھنے کی کوشش کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انسانیت نے ہمیشہ اپنی تاریخ کو آگے منتقل کیا ہے۔ تاریخ میں ماضی کے واقعات کا یہ انتقال تین طریقوں سے ہوا ہے۔

تاریخ منتقل ہونے کے تین طریقے

تاریخ کے انتقال کا پہلا طریقہ زبانی روایات کا ہے۔ یعنی لوگ کسی واقعے کو بیان کرنے لگتے ہیں۔ یہ آج بھی ہوتا جب کسی جگہ کوئی واقعہ پیش آتا ہے تو دیکھنے والے اس کو آگے ان لوگوں کے سامنے بیان کرنا شروع کر دیتے ہیں جو براہ راست اس واقعے کے گواہ نہیں ہوتے۔ یہی معاملہ ایک نسل سے دوسری نسل کا ہوتا ہے کہ لوگ اپنی اگلی نسلوں تک اہم واقعات زبانی بیانات کی شکل میں منتقل کرتے ہیں۔ یہی زمانہ قدیم میں ہوتا تھا۔

تاریخ کے انتقال کا دوسرا طریقہ تحریر کا ہے۔ یعنی کسی واقع کے پیش آنے پر کوئی ہم عصر شخص جس نے یہ واقعہ دیکھا ہو یا ان لوگوں سے براہ راست سنا ہو جو وہاں موجود تھے، وہ اسے لکھ دے۔ ابتدائی زمانوں میں اس کی زیادہ اہمیت نہیں تھی۔ کیونکہ اول تو فن تحریر عام نہیں تھا۔ دوسرے یہ کہ انسانی سماج جب ابتدائی شکل میں تھا تو اس کی اہمیت کا کوئی احساس تھا نہ ضرورت۔ کیونکہ زبانی روایات میں سب کچھ بیان ہو ہی جایا کرتا تھا۔ تاہم علم اور سماج کے ارتقا کے ساتھ تاریخ کو لکھا جانے لگا اور عام طور پر مغربی علم میں ہیروڈوٹس جس کا زمانہ پانچویں صدی قبل مسیح تھا، پہلا مورخ سمجھا جاتا ہے۔ گرچہ مشرق میں مذہبی علم کی روایات اور مذہبی کتب کو بہت پہلے ہی مرتب کر دیا گیا تھا۔

تاریخ کے انتقال کا تیسرا ذریعہ کسی قوم سے متعلق آثار قدیمہ اور اس کے باقیات ہوتے

ہیں یا پھر زمانہ قدیم میں کسی قوم یا گروہ کی محفوظ رہ جانے والی کچھ نشانیاں ماہرین کی کوششوں سے منظر عام پر آجاتی ہیں اور ماضی کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کا سبب بن جاتی ہیں۔

قومی داستانیں اور مصدقہ تاریخ

تاریخ کے بارے میں ہمیشہ سوال یہ اٹھایا جاتا ہے کہ گرچہ یہ ماضی کے واقعات کا ایک ریکارڈ ہے، مگر اس ریکارڈ میں کیا بات سچی ہے اور کیا جھوٹی یا پھر مبالغہ آرائی پر مبنی ہے۔ تاریخ کے ماہرین کوشش کرتے ہیں کہ ماضی کے واقعات سے متعلق ملنے والی معلومات کی دیگر خارجی ذرائع سے تصدیق کریں۔ اگر تصدیق نہیں ہو پاتی تو ایسے واقعات کو کسی خاص قوم یا کلچر کی داستان یا دیو مالا سمجھا جاتا ہے۔ جیسے یونانی اور ہندی دیو مالا اور یہود و نصاریٰ کی مذہبی روایات کے ایک بڑے حصے کو بھی بڑی حد تک اسی پہلو سے دیکھا جاتا ہے۔ یہی اجتماعی طور پر منتقل ہونے والے واقعات کا اصل مسئلہ تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ خارجی ذرائع سے ان کی تصدیق ہونے کے ذرائع معدوم ہوتے چلے جاتے تھے۔ کیونکہ قومیں ختم ہو جاتی ہیں، ہجرت کر جاتی ہیں، دوسری اقوام میں ضم ہو جاتی ہیں، شکست کھا کر منتشر ہو جاتی ہیں۔ ایسے میں تاریخی حقائق معدوم ہو جاتے ہیں یا پھر ان کے ساتھ خواہشات اور اضافے جمع ہونے لگتے ہیں۔ مصدقہ تاریخ ماضی کے دھندلکوں، توہمات کی گرد اور مبالغوں کی کہر میں کہیں چھپ جاتی اور صرف غیر مصدقہ داستانیں، کہانیاں اور اساطیر الاولین ہی باقی بچتی تھیں۔ جو ظاہر ہے کہ تاریخ میں کوئی معتبر چیز نہیں سمجھی جاتیں۔

تاریخ کا انفرادی اور اجتماعی ریکارڈ

ان درست خبروں میں بھی دو طرح کی خبریں یا معلومات ہوتی ہے۔ ایک وہ جو انفرادی طور پر کوئی فرد یا چند افراد بیان کر رہے ہوں۔ دوسری وہ جو سب کے سب لوگ بیان کر رہے ہوں۔

ان دونوں کا فرق ایک مثال سے سمجھا جاسکتا ہے کہ 1947 میں برصغیر ہندوستان اور پاکستان نامی دوملکوں میں تقسیم ہوگیا۔ یہ واقعہ اجتماعی سطح پر پیش آیا۔ کروڑوں لوگ براہ راست اس سے متاثر ہوئے۔ انھوں نے براہ راست اس حقیقت کا مشاہدہ کیا۔ یہ وہ خبر ہے جو پوری کی پوری قوم اجماعی طور پر آگے منتقل کررہی ہے۔ آج کے دن تک دنیا میں وہ دواقوام موجود ہیں جو اس سے متاثر ہوئیں اوران کی علمی روایت پوری قوت سے اس واقعے کی تصدیق کررہی ہے۔ ایسے کسی واقعے کے جھوٹ ہونے کا سرے سے کوئی امکان ہی نہیں۔ اس واقعے کو اپنی تصدیق کے لیے کسی خارجی ذریعے، کسی تحریری تاریخ، کسی انفرادی شہادت کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ ایک مسلمہ ہوتا ہے۔ اس کا اگر انکار کیا جائے گا تو پھر اس بات کا بھی انکار کیا جاسکتا ہے کہ زمین ہر روز سورج کی روشنی سے منور ہوتی ہے۔

تاہم اس طرح کی تاریخ صرف اجتماعی اور قومی معاملات کو ریکارڈ کرسکتی ہے۔ جبکہ تاریخ ظاہر ہے کہ اس سے کہیں زیادہ چیزوں کا احاطہ کرتی ہے۔ خاص طور پر انفرادی نوعیت کے تمام واقعات کچھ خاص افراد کے ساتھ ہی پیش آرہے ہوتے ہیں اور انھی سے متعلق لوگوں کی گواہی پر ان کی تفصیل مرتب کی جاتی ہے۔ جیسے پاکستان کے بانی قائداعظم یا علامہ اقبال کا انتقال جس روز ہوا تھا، اس دن کیا واقعات پیش آئے۔ ان کی آخری گفتگو اور کیفیات کیا تھیں۔ ظاہر ہے کہ یہ واقعات چندلوگوں کے سامنے ہی پیش آرہے ہوتے ہیں، اس لیے انھی کے بیانات اور گواہی کی بنیاد پر دوسرے لوگوں کو اس کا علم ہوتا ہے۔ اس ذریعے سے گرچہ کسی واقعے کی جزوی تفصیلات نیز کسی فرد کی ذاتی زندگی اور معاملات کی تفصیل حاصل ہورہی ہوتی ہے تاہم اس میں یہ امکان ہوتا ہے کہ بات کچھ سے کچھ ہوگئی ہو یا اصل واقعے کے بیان میں کوئی کمی بیشی ہوگئی ہو۔ اسی طرح ایک ہی واقعے کے حوالے سے مختلف اور متضاد معلومات بھی سامنے آجاتی ہیں۔

چنانچہ پہلے کی شکل میں اگر یہ فائدہ ہوتا ہے کہ مسلمہ معلومات سامنے آتی ہیں، مگر کمی یہ رہ جاتی ہے کہ تفصیلی اور جزئی معلومات اس ذریعے سے کبھی سامنے نہیں آتیں جبکہ دوسرے ذریعے سے تفصیلی اور جزئی معلومات ملتی ہے، مگر اس میں ہمیشہ غلطی،، کمی بیشی اور تضاد کا امکان رہتا ہے۔

رسول اللہ صلی وعلیہ وسلم کا معجزہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ یہ ہے کہ آپ کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ نے تاریخ میں پہلی دفعہ اس معجزے کو جنم دیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی ہستی جس طرح ایک مسلمہ اور ناقابل انکار تاریخی حقیقت ہے، ٹھیک اسی طرح آپ کی لائی ہوئی تعلیمات اپنی جزئی تفصیلات میں بھی ایک تاریخی مسلمے کے طور پر محفوظ کی گئی ہے۔ یہ وہ چیز ہے جو علم تاریخ کے لیے بھی ایک بالکل نئی چیز تھی۔ جیسا کہ پیچھے بیان ہوا اس سے قبل انسانی تاریخ صرف اس بات سے واقف تھی ماضی کے واقعات انفرادی رپورٹس کی بنیاد پر آگے منتقل ہوتے تھے، مگر ہمیشہ ان میں غلطی اور کمی بیشی کا امکان رہتا تھا جب کہ اجتماعی اور قومی علم کے ذریعے سے صرف بڑے واقعات ہی منتقل ہوتے تھے۔ اور ان میں بھی یہ مسئلہ تھا کہ زیادہ وقت نہیں گزرتا تھا کہ قوم ماضی کے غبار میں گم ہوجاتی اور اجتماعی اور قومی تاریخ کے بڑے واقعات بھی داستان اور اگلوں کی غیر مستند اور سنی سنائی داستان ہی بن کر رہ جاتے تھے۔

تاہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ یہ معجزہ ہوا کہ آپ کی ہستی کے ساتھ آپ کی تعلیمات کا ریکارڈ بھی قومی طور پر آگے منتقل ہوا اور ایک ناقابل تردید مسلمہ کے طور پر آج دنیا میں موجود ہے۔ یہ معجزہ کس طرح وجود میں آیا یہ سمجھنا قارئین کے لیے بہت آسان ہوگا، اگر وہ تاریخ کے حوالے سے پیچھے بیان کیے گئے حقائق کو ذہن میں رکھیں گے۔ ساتھ ہی اس معجزے کو سمجھنے کے لیے اب ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں کیا تاریخ وجود میں آئی۔

رسول اللہ صلی وعلیہ وسلم کے دور میں بننے والی تاریخ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم 570ء میں مکہ میں پیدا ہوئے اور 632ء میں دنیا سے رخصت ہوئے۔ آپ نے 40 برس کی عمر میں اعلان نبوت فرمایا اور صرف 23 برس کی مختصر مدت کے بعد آپ انسانی تاریخ کے سب سے کامیاب انسان کی حیثیت سے دنیا سے رخصت ہوئے۔ آپ کو اپنی قوم پر جو غلبہ اور اپنے مشن میں جو کامیابی حاصل ہوئی اس کے چند پہلو بہت اہم ہیں۔ یہ پہلو درج ذیل ہیں۔

۱) پوری قوم کا ایمان

آپ نے 40 برس کی عمر میں نبوت کا اعلان کیا تو آپ تنہا مسلمان تھے۔ مگر 23 برس کے بعد جب آپ دنیا سے رخصت ہوئے تو انسانی تاریخ کا یہ عجیب واقعہ رونما ہو چکا تھا کہ آپ کی پوری قوم یعنی بنی اسماعیل، تمام کے تمام، آپ پر ایمان لا کر آپ کے پیروکار بن چکے تھے۔ آپ اور آپ کی قوم کے درمیان جاری کشمکش میں بمشکل ہزار لوگ ہی مارے گئے۔ باقی قوم ایمان لے آئی اور آپ کا مشن پھیلانے کے لیے آپ کے بعد موجود رہی۔ خیال رہے کہ آپ کی قوم دنیا کے دور دراز خطے میں موجود کوئی چھوٹا قبیلہ یا گروہ نہ تھا بلکہ اُس دور کی متمدن دنیا کے مرکز میں واقع لاکھوں مربع میل پر پھیلے ہوئے جزیرہ نما عرب میں لاکھوں افراد پر مشتمل ایک پوری قوم تھی۔

۲) تربیت کا بھرپور وقت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مشن 8 ہجری میں فتح مکہ کے ساتھ پورا ہو گیا۔ کفار مکہ کے قبول اسلام کے بعد تمام عرب سے آپ کی مخالفت ختم ہو گئی اور لوگ جوق در جوق ایمان لانے لگے۔ فتح مکہ رمضان 8 ہجری تا وفات ربیع الاول 11 ہجری تک آپ کے پاس ڈھائی برس کا وقت تھا

جس میں لوگ آپ کے پاس آتے رہے اور دین سیکھتے رہے۔ آپ کے پاس پرامن حالات میں لوگوں کو دین سکھانے، سمجھانے اور پھیلانے کے لیے 30 مہینے کا طویل وقت تھا۔ پھر آخری حج کے موقع پر تمام عرب سے کم و بیش ایک لاکھ لوگ حج کے لیے آپ کے ساتھ آئے۔ گویا عرب کے ہر گھر، بستی، قریے کا ایک نہ ایک آدمی لازماً اس موقع پر موجود تھا۔ اس حج کا خصوصی مقصد لوگوں کو یہ موقع دینا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست دین سیکھ لیں۔ اس طرح یہ بات پورے اعتماد سے کہی جا سکتی ہے کہ جو دین آپ لائے وہ پوری قوم کو خود اپنی نگرانی میں سکھا کر رخصت ہوئے۔

۳) مکمل سیاسی استحکام اور غلبہ

اس دنیا میں کسی بھی فکر کے لیے یہ بڑا مسئلہ ہوتا ہے کہ وہ اخلاقی اور علمی بنیادوں پر مخالفین پر فتح حاصل کر لے تب بھی مخالفین کی سیاسی طاقت اس کے قدم جمنے نہیں دیتی۔ تاہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی زندگی میں عرب پر مکمل سیاسی غلبہ حاصل ہو چکا تھا۔ آپ پورے عرب کے بلا شرکت غیر حکمران تھے اور تمام مخالفین اسلام لے آئے، ختم ہو گئے یا پھر ذلت آمیز محتاجی میں سر اطاعت خم کیے ہوئے تھے۔ یہ غلبہ آپ کے خلفائے راشدین کے درمیانی عرصے تک تقریباً اگلے 20 برس میں اتنا بڑھا کہ تمام متمدن دنیا آپ کے ابتدائی پیروکاروں کے سامنے مغلوب ہو چکی تھی۔ تمام دنیا کے خزانے، وسائل اور طاقت اب مسلمانوں کے قبضے میں تھی۔ چنانچہ اس بات کا کوئی امکان ہی نہیں تھا کہ کوئی بیرونی یا اندرونی قوت بانی اسلام کی تعلیمات کے فروغ اور پھیلاؤ میں کسی قسم کی رکاوٹ ڈال سکے۔ کیونکہ ہر طاقت مسلمانوں کے سامنے مغلوب ہو چکی تھی اور دنیا کا ہر خزانہ ان کے لیے کھل چکا تھا۔

۴) تربیت یافتہ ٹیم

آپ کا اگلا امتیاز یہ تھا کہ آپ کی ابتدائی نبوت ہی سے آپ کو انتہائی مخلص، باشعور اور قابل ساتھیوں کی دولت میسر آ گئی تھی۔ مکہ میں آپ پر سیکڑوں لوگ ایمان لا چکے تھے۔ مدینہ میں ان کی تعداد ہزاروں تک پہنچ گئی۔ ان لوگوں کو قرآن میں بار بار یہ بتا دیا گیا تھا کہ دنیا تک دینِ حق کی شہادت دینا ان کی ذمہ داری ہے۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے سیکڑوں اہل ایمان مکہ کے 13 برس اور پھر ہزاروں لوگ مدینہ کے 11 برسوں میں لمحہ لمحہ حضور کے ساتھ رہے۔ آپ کے پیغام کو بھرپور طریقے سے سمجھا۔ آپ کی نگرانی میں دو عشرے تک اس پر عمل کیا۔ اقوام عالم پر شہادت حق کے شعور اور اتنی زیادہ تربیت کے بعد یہ لوگ جب خلافت راشدہ میں دنیا کی طرف متوجہ ہوئے تو ان کا اصل مقصد ایک ہی تھا۔ وہ یہ کہ جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر شہادت حق دی تھی، ٹھیک اسی طرح انھوں نے اس دور کی متمدن دنیا کے انسانوں کے سامنے شہادت حق دی۔ چنانچہ ایک طرف انھوں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد پیدا ہونے والے کسی بھی ممکنہ انحراف کو پوری قوت کے ساتھ روکا، بلکہ آگے بڑھ کر ملینز (Millions) کی آبادی پر مشتمل مڈل ایسٹ میں ہر جگہ اسلام کا پیغام ٹھیک اسی طرح پہنچایا جیسے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں تک پہنچایا تھا۔

۵) عالمی تاریخی تسلسل کا حصہ بن جانا

جیسا کہ پیچھے بیان ہوا کہ جزیرہ نما عرب کوئی دور دراز علاقہ نہ تھا بلکہ چین و ہند سے لے کر مصر و یونان تک پھیلی اس وقت کی متمدن دنیا کے عین وسط میں واقع علاقہ تھا جہاں لاکھوں لوگ آباد تھے۔ یہ لوگ اس وقت کی دو عظیم ترین سپر پاور یعنی رومی اور ساسانی سلطنت کے پڑوسی تھے اور عرب کی سرحدوں پر ان سپر پاور کے حلیف عرب قبائل کی حکومتیں قائم تھیں۔ تجارت کے لیے سردیوں میں یمن جاتے جہاں مشرق سے چین و ہندوستان کا مال آتا اور گرمیوں میں شام و

فلسطین جاتے جہاں مغرب سے مصر و افریقہ کا مال آتا۔

سیاست اور تجارت کے اس پس منظر کی بنا پر عرب میں اس زمانے میں جو کچھ ہو رہا تھا وہ کوئی مقامی واقعہ نہیں تھا بلکہ اُس دور کی پوری دنیا کو معلوم ہو رہا تھا کہ عرب میں کیا انقلاب آ چکا ہے۔ پھر خلافت راشدہ میں تو یہ دونوں ریاستیں مسلمانوں سے شکست کھا گئیں اور خود مسلمانوں نے ان کی جگہ لے لی۔ یوں عرب کا انقلاب کوئی مقامی واقعہ نہ رہا بلکہ اسی زمانے میں بین الاقوامی تاریخ کا ایک مسلمہ حصہ بن گیا۔

۶) مسلمانوں کا مسلسل باقی رہنا

اس سلسلے کی آخری اہم ترین کڑی یہ ہے کہ ابتدائی غلبے کے بعد دنیا کے نقشے سے کبھی بھی مسلمان نہیں مٹائے جا سکے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر آج تک کروڑوں بلکہ اربوں مسلمان ہر دور میں دنیا کے ہر خطے میں موجود رہے۔ بیسویں صدی کی ابتداء کے چند عشروں کو چھوڑ کر مسلمان ہمیشہ اقتدار میں رہے۔ وہ پورے تواتر، تسلسل اور اطمینان اور سکون کے ساتھ اپنے اس دین پر عمل کرتے رہے جو ان کے نبی انھیں دے کر رخصت ہوئے۔

ایک استثنائی واقعہ

مذکورہ بالا تمام چیزیں انسانی تاریخ میں پیش آنے والا ایک استثنائی واقعہ ہے جو کبھی پہلے پیش آیا نہ بعد میں ظہور پذیر ہو سکا۔ اب تمام چیزوں کو جمع کر لیجیے تو جو نتیجہ نکل رہا ہے وہ یہ ہے دنیا میں کسی بھی فکر کے لیے یہ کبھی ممکن نہیں رہا کہ فکر کا بانی اپنی دعوت پیش کرے اور اس کی زندگی ہی میں لوگ اسے قبول کر لیں۔ پھر اسے اقتدار کا تحفظ اور پر امن حالات بھی میسر آ جائیں جس میں اس کی دعوت اور پیغام مکمل طور پر ہر طرح کے بیرونی خطرے سے محفوظ رہ سکے۔ وہ پورے اطمینان سے ان کی تربیت کرے، پھر اس کو ایسی مخلص اور باشعور ٹیم بھی میسر ہو جو اس کی تعلیم اور

مشن کو بغیر کسی انحراف اور کمی بیشی کے دوسروں تک پہنچائے۔ عین اس کی عین حیات اور اس کے فوراً بعد یہ انقلاب عالمی تاریخی تسلسل کا غالب حصہ بن جائے اور پھر تواتر اور تسلسل کے ساتھ اُس وقت سے آج تک اس کے پیروکار اس دین پر عمل بھی کرتے رہیں۔ یہ واقعہ انسانی تاریخ میں نہ پہلے کبھی ہوا نہ بعد میں کبھی ہو سکا۔

اس بات کو دور جدید اور دور قدیم کی ایک مثال سے سمجھیں۔ حضرت موسیٰ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد تاریخ کے دوسرے کامیاب پیغمبر ہیں۔ قوم کا ایمان، مخالفین پر غلبہ، سیاسی اقتدار اور نام لیواؤں کا باقی رہنا آپ کو سب ملا۔ مگر آپ کی زندگی ہی میں آپ کی ٹیم نے بار بار آپ سے بے وفائی کی اور آپ کے بعد تاریخ میں بار بار آپ کی قوم کی جڑ کاٹی گئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ آپ کی لائی ہوئی کتاب اپنی اصل شکل میں محفوظ نہ رہی اور آپ کی تعلیمات کی بنیادی چیز یعنی نماز جیسی بنیادی عبادت سے آج کے یہود خود پوری طرح واقف نہیں۔ جبکہ مصر کی اپنی تاریخ میں اِس پورے واقعے کا کوئی ریکارڈ سرے سے موجود ہی نہیں۔ جب حضرت موسیٰ جیسے کامیاب پیغمبر کا یہ حال ہے تو باقی پیغمبروں کو تو جانے دیجیے۔

اس معاملے میں ایک جدید اور سیکولر مثال کمیونزم کی ہے۔ اس کے بانی کارل مارکس کو اس کا غلبہ دیکھنا نصیب نہیں ہوا اور پھر اس کے پیروکاروں نے اس کے افکار کی عملی شکل کو وجود میں لانے کے عمل میں جو کچھ کیا وہ اب تاریخ کا حصہ ہے، بلکہ سوویت یونین کی شکست کے بعد خود کمیونزم تاریخ کا حصہ بن چکا ہے۔ اس کے برعکس نبی آخر الزماں کی دعوت مذکورہ بالا تاریخی حقائق کی بنا پر جیسے نازل ہوئی ویسے ہی آج کے دن تک موجود ہے۔

ایک نئی تاریخی حقیقت کا ظہور

مذکورہ بالا چھ عوامل کی بنا پر آج یہ ایک مسلمہ اور ناقابل انکار تاریخی حقیقت ہے کہ نبی کریم

صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت اور عرب کا انقلاب جس طرح تاریخ کا ایک مسلمہ ہے، ٹھیک اسی طرح آپ کی تعلیمات جو خود ہمیشہ جزئی چیزوں اور تفصیلات پر مشتمل ہوتی ہے بالکل ایسے ہی موجود ہے جیسے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں تھیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ایک طرف وہ سارے مذکورہ بالا تاریخ عوامل موجود تھے جن کی بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا محفوظ رہنا تاریخی طور پر ممکن ہوا بلکہ آپ نے اس کے ابلاغ کے لیے جو اہتمام کیا اس کی بنا پر آپ کی تعلیمات کچھ افراد تک نہیں رہیں بلکہ پوری قوم کی قولی اور عملی روایت کا حصہ بن گئیں۔ یعنی آپ کی تعلیمات کے جزئی عناصر بھی لاکھوں اور پھر کروڑوں افراد کے قول وفعل کا اس طرح حصہ بن گئے کہ تاریخ میں پہلی دفعہ جزئیات بھی مسلّمات بن گئیں۔

اس تعلیم کا پہلا جز قران مجید ہے۔ الحمد سے والناس یہ کتاب جس کی حفاظت کا وعدہ اللہ نے کیا تھا خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں مرتب ہوگئی تھی۔ آپ خود حافظ قران تھے اور آپ کے زمانے ہی میں ہزاروں حفاظ موجود تھے۔ قرآن کے حفظ کی وجوہات بالکل واضح ہیں۔ اول یہ کہ اس دور میں حصول علم کا معیار چیزوں کو زبانی یاد کرنا تھا۔ اس سے کہیں زیادہ اہم یہ حقیقت تھی کہ پنج وقتہ نماز جو اسلام کی بنیادی شرط تھی اور اس زمانے میں منافقین تک کو بھی ادا کرنی پڑتی تھی، قران کی قرات اس کا لازمی حصہ تھی۔ چنانچہ لاکھوں لوگوں کے لیے لازمی تھا کہ نماز پڑھنی ہے تو قرآن کا کچھ نہ کچھ حصہ یاد کرنا ہوگا۔ عربوں کے پس منظر میں یہ بات ناقابل قبول ہے کہ وہ ہماری طرح تمام نمازیں "قل ھو اللہ احد" کے سہارے ادا کر لیتے ہوں گے۔ انھیں قرآن مجید کا ایک بڑا حصہ لازمی یاد ہوگا۔ مزید یہ کہ تہجد کی نماز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ساتھ صحابہ کی ایک بڑی تعداد کا معمول تھا۔ اس میں طویل قرات کی وجہ سے لوگ پورا قرآن یاد کر لیتے تھے۔ چنانچہ ہزاروں حفاظ حضور کے زمانے ہی میں موجود تھے۔ پھر حضرت

عمر کے دور میں تراویح کا وہ اہتمام شروع ہوا جس کی بنا پر عالم اسلام کے ہر قریے اور ہر مسجد اور ہر بستی میں کسی نہ کسی حافظ کا ہونا لازمی ہو گیا۔تب سے آج تک یہ رسم ایسے ہی جاری ہے۔ان لاکھوں حفاظ کی وجہ سے قرآن مجید جیسا کہ وہ نازل ہوا ویسا ہی آج کے دن تک موجود ہے۔

ایک اشکال کا جواب

بعض قارئین یہ سوچ رہے ہوں گے کہ اس موقع پر میں نے کتابت قران کا ذکر نہیں کیا۔بلاشبہ حفاظت قران مجید کے لیے یہ اہتمام بھی کیا گیا کہ نازل ہونے والی وحی کو اسی وقت لکھوالیا جاتا تھا۔مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ حفاظت قرآن کا اصل نہیں بلکہ ثانوی اہتمام تھا۔اللہ تعالیٰ نے تورات تختیوں پر اتاری مگر قرآن قول کی شکل میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب اطہر پر محفوظ کیا گیا۔اس سے صاف ظاہر ہے کہ منشائے الٰہی یہ تھا کہ قرآن کی اصل حفاظت قول اور سماعی طریقے پر کی جائے۔یہ بڑی حکیمانہ بات تھی۔کیونکہ اُس وقت عرب میں نہ کاغذ تھا، نہ پرنٹنگ پریس ایجاد ہوا تھا اور نہ عام عربوں میں لکھنے کا بہت رواج تھا۔ بلکہ اصل اہتمام چیزیں یاد کرنے کا ہی تھا۔نماز میں قرآن پڑھنے کی شرط نے اس ذوق کو مذہبی ضرورت بنا دیا اور یوں بہت سا قرآن ہر شخص کو اور پورا قرآن بہت سے لوگوں کو یاد ہو گیا۔یوں قرآن کی اصل حفاظت حفظ و سماعت کے طریقے پر ہوئی ہے۔کتابت ایک ثانوی اور اضافی اہتمام تھا۔یہ بات سیدنا عمر کی اس بات سے بھی واضح ہو جاتی ہے جب جنگ یمامہ میں 400 یا بعض روایات کے مطابق 700 سے زائد صحابہ کی شہادت ہوئی تو آپ نے یہ اندیشہ ظاہر کیا کہ اسی طرح جنگوں میں صحابہ کرام شہید ہوتے رہے تو قرآن ضائع نہ ہو جائے۔صاف ظاہر ہے کہ اصل حفاظت حفظ سے ہو رہی تھی۔کتابت وہ اضافی اہتمام تھا جو صرف اس خطرے کے پیش نظر اختیار کیا گیا کہ حفاظ کی اکثریت شہید ہو گئی تو قرآن متاثر نہ ہو۔مگر ہم جانتے ہیں کہ حضرت عمر کے دور میں تراویح کا

اہتمام ہوتے ہی یہ خطرہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔

ایک مناظرے کی روداد

قرآن کی اصل حفاظت کتابت کے بجائے حفظ و سماعت کو نمایاں کرنے کی ایک اور وجہ ہے۔وہ یہ کہ آج کل کے مسلمانوں میں یہ بات بہت پھیل گئی ہے کہ قرآن کی حفاظت کا اصل ثبوت یہ ہے کہ حضرت عثمان کا مرتب کیا ہوا قرآن کا نسخہ استنبول کے توپ کاپی میوزیم اور تاشقند میں محفوظ ہے۔ہم بھی عرصے تک یہی سمجھتے تھے۔مگر بارہ تیرہ برس پہلے میں نے ایک مناظرے میں یہ تماشہ دیکھا کہ ایک مسلمان مناظر نے مسیحیت پر اسلام کی برتری ثابت کرنے کے لیے جیسے ہی یہ بات کہی، جواب میں مسیحی پادری کھڑا ہوا اور اس نے بتایا کہ میں نے خود ان نسخوں کو دیکھا ہے اور ان کی کاربن ڈیٹنگ کی ہے۔اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نسخے اول تو حضرت عثمان کے زمانے کے بہت بعد کے ہیں۔یعنی دوسری صدی ہجری کے اور دوسرے ان میں موجود قرآن پورا ہے بھی نہیں۔اس کے بعد سارے مسلمان حاضرین اور ناظرین کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔اور اب یہ بات کم و بیش سارے علمی حلقوں میں تسلیم کر لی گئی ہے کہ عہد خلافت راشدہ کا کوئی قرآن اس وقت دنیا میں موجود نہیں ہے۔اس لیے اسلام مخالف مستشرقین یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ قرآن مجید کی نسبت یہ کہنا کہ یہ بعینہٖ وہی کتاب ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی درست نہیں۔

تاہم جیسا کہ ہم نے بیان کیا کہ یہ ایک غلط فہمی ہے۔قرآن اصل میں حفظ کے ذریعے محفوظ ہوا ہے۔اور مذکورہ بالا ان چھ عوامل کی بنا پر جو ہم نے شروع میں گنوائے ہیں۔یہ بات یقینی ہے کہ یہ وہی قرآن ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا۔اگر کوئی اس کا انکار کرتا ہے تو پھر وہ اس کا بھی انکار کرتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نام کی کوئی ہستی عرب میں مبعوث ہوئی۔انھیں

اپنی قوم پر پورا غلبہ حاصل ہوا۔ ان کے ساتھ 20 برس تک ہزاروں افراد دن رات رہ کر دین سیکھتے رہے۔ ان لوگوں کو دنیا پر اقتدار حاصل ہوا اور آج کے دن تک ان کے ماننے والے دنیا میں موجود رہے۔ اگر ان تمام مسلّمات کا انکار نہیں ہوسکتا تو پھر اس حقیقت کا انکار بھی نہیں ہوسکتا کہ جو قرآن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا وہ آپ کی زندگی میں محفوظ کرلیا گیا اور آپ کے ساتھیوں نے وہ پورے اہتمام سے باقی دنیا تک اور پھر ہر دور میں آپ کے پیروکاروں نے اسے پورے اہتمام سے محفوظ کیا ہے اور آج کے دن تک یہ سلسلہ جاری وساری ہے۔

جو شخص اس حقیقت کا منکر ہو اسے یہ سوچنا چاہیے کہ آج کے گئے گزرے دور میں جب پرنٹنگ پریس کی ایجاد کے بعد حفظ قرآن ثانوی حیثیت اختیار کر گیا ہے، لاکھوں مسلمان پورا قرآن حفظ کرتے ہیں تو زمانہ نبوت اور خلافت راشدہ کے دور میں یہ کیسے ممکن ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تربیت یافتہ صحابہ کرام نے اس فریضے میں کوئی کوتاہی برتی ہوگی۔ اس لیے یہ بات ہر شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ہزاروں اور آپ کے بعد لاکھوں لوگ قرآن کو پورا یاد کرتے رہے اور یہی قرآن آج ہمارے پاس موجود ہے۔

اسلاف کی رائے

قرآن کی طرح ٹھیک یہی معاملہ دین کے عملی ڈھانچے کا ہے جو عبادت، معاشرت اور زندگی کے دیگر پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے ہی سے اگر لاکھوں لوگ قرآن کو نمازوں میں پڑھ رہے تھے تو اس کے ساتھ وہ نماز بھی پڑھ رہے تھے، روزہ بھی رکھتے تھے، حج بھی کرتے تھے، زکوۃ بھی دیتے تھے، نکاح وطلاق، معیشت ومعاشرت، رسوم وآداب میں ہر جگہ لوگ اسلام کے احکام پر عمل پیرا تھے۔ ایک پوری قوم کے ایمان لانے، تربیت یافتہ ہونے، مسلسل موجود ہونے کا کوئی دوسرا نتیجہ نکل ہی نہیں سکتا۔ اس کا انکار تاریخی مسلمے کا انکار

ہے۔ جس طرح قرآن مجید پر خلافت راشدہ کے لکھے ہوئے قرآن کی گواہی طلب کرنا ایک غیر علمی بات ہے، اسی طرح اس عملی ڈھانچے کو کسی روایت پر موقوف سمجھنا ہر اعتبار سے ایک غیر علمی رویہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو کام لاکھوں لوگ کر رہے ہوں اور علما کی پوری روایت اس کی نگرانی کر رہی ہو وہ اپنی ذات میں خود ایک مسلمہ بن جاتی ہے۔ اس پر خارج سے کوئی ثبوت طلب نہیں کیا جاسکتا۔ یہی وہ طریقہ ہے جس پر ہمارے اسلاف اور متقدمین دین کی حجیت ثابت کرتے تھے۔ چنانچہ مسلمانوں کے عظیم امام شافعی اپنی کتاب الرسالہ میں اس کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''یہ وہ احکام ہیں جنہیں سمجھنا، ان پر عمل کرنا، اپنے جان ومال کے ذریعے اپنی ذمہ داریوں کو ادا کرنا اور حرام کئے گئے کاموں سے بچنا ہر شخص پر لازم ہے۔ یہ تمام احکام اللہ کی کتاب، واضح نص میں بیان کئے گئے ہیں اور مسلمانوں میں ان پر عام طور پر عمل کیا جاتا ہے۔ لوگ انہیں نسل در نسل منتقل کرتے ہیں اور یہ سلسلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم سے چلا آ رہا ہے۔ ان احکام کے منتقل کرنے یا ان کی فرضیت میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ یہ وہ علم ہے جس سے متعلق معلومات اور اس کی تشریح ہر طرح کی غلطیوں سے پاک ہے۔ اس میں کسی قسم کا اختلاف کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔'' (1/358)

اس کا آخری جملہ پھر پڑھیے کہ کس طرح یہ علم ہر غلطی اور اختلاف سے پاک ہے۔ پھر یہی بات ایک علم حدیث کے ایک اور بہت بڑے امام حافظ ابن عبدالبر (463ھ) اپنی کتاب جامع بیان العلم وفضلہ میں اس طرح لکھتے ہیں:

''علم کی دو بنیادیں ہیں۔ کتاب اللہ اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم۔ سنت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جسے تمام لوگ تمام لوگوں تک (نقل کافہ عن کافہ) منتقل کرتے ہیں۔ یہ وہ حجت قاطع ہے جس میں کسی قسم کا اختلاف ثابت نہیں اور اس کا انکار نصوص الہی کے انکار

کے مترادف ہے۔'' (ص625)

دین کی تاریخی حجیت ثابت کرنے کا یہ وہ طریقہ تھا جو ہمارے متقدمین نے اختیار کیا تھا۔ اس طریقے میں دینی تعلیمات وہ مسلمہ بن جاتی ہیں، جن کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت ایک ناقابل انکار حقیقت بن جاتی ہے۔ یہ وہ چیز ہے جو دنیا کے کسی دوسرے دین کو حاصل نہیں۔ یہ بات واضح رہے کہ مسلمانوں نے اس کے علاوہ اپنے نبی کے قول، علم اور تقریر کی حفاظت کا بھی حتی الوسع بہت اہتمام کیا ہے۔ یہ بڑا قیمتی اور اہم ذخیرہ ہے، جس کے ذریعے سے دین کو سمجھنے، عمل کرنے اور نئے پیش آنے والے مسائل میں اجتہاد کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ لیکن ہم اسے یہاں اس لیے زیر بحث نہیں لائے کہ یہ ذخیرہ ہم مسلمانوں کے نزدیک تو حجت بن سکتا ہے، غیر مسلموں کے لیے تاریخی حجت اگر کوئی چیز بن سکتی ہے تو وہی تواتر کے ساتھ ملا ہوا دین ہے اور جس کا انکار کرنا علم تاریخ کی بنیاد پر ناممکن ہے۔

خلاصہ بحث

یہ بحث ذرا طویل ہوگئی، مگر یہ اتنی غیر معمولی اہمیت کی بات ہے کہ اسے پوری طرح سمجھنا ضروری ہے۔ ایک ایسے دور میں جب انٹرنیٹ کی وجہ سے جب غیر مسلموں کے تمام اعتراضات ہمارے گھر گھر میں پہنچ رہے ہیں، ہم پر لازم ہے کہ اپنے دین کی حقانیت کے دلائل علم کے ان مسلمات کی بنیاد پر لوگوں کے سامنے پیش کریں جن کا انکار کرنا ممکن نہیں۔ شتر مرغ کی طرح ریت میں سر چھپا لینا یا پھر کمزور جگہ سے اسلام کا دفاع کرنا ایک خطرناک رجحان ہے۔ اس طرح ہم اپنے دین کا مقدمہ خود کمزور کر دیں گے۔

فتنہ دجال اور سورۂ کہف

ہمارے ہاں بعض روایات میں آنے والے فضائل کی بنا پر ہر جمعہ کے روز سورۂ کہف پڑھنا بہت سے لوگوں کا معمول ہے۔ متعدد روایات میں اس سورت کی یہ فضیلت بیان ہوئی ہے کہ جمعے کے دن اس سورت کی تلاوت اگلے جمعے تک ایک نور کا سبب بن جاتی ہے۔ امام البانی نے صحیح الترغیب و الترھیب (736) میں ان روایات کو صحیح قرار دیا ہے۔ جبکہ امام مسلم نے اپنی صحیح میں یہ روایت کیا ہے کہ اس سورت کی ابتدائی (بعض روایتوں کے مطابق آخری) دس آیات حفظ کرنے والا فتنۂ دجال سے بچا لیا جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر نماز کے بعد دجال کے فتنے سے اللہ کی پناہ مانگی ہے اور متعدد طریقوں سے نہ صرف اس فتنے پر متنبہ کیا ہے بلکہ اس سے بچنے کا طریقہ بھی بتایا ہے۔

فتنۂ دجال کیا ہے یہ اپنی جگہ خود ایک تفصیلی بحث ہے۔ اس بارے میں اہل علم کی تین آرا ہیں۔ ایک وہ جو سب سے زیادہ مقبول ہے کہ قیامت سے قبل ایک غیر معمولی قوتوں کے حامل شخص کا ظہور ہوگا جو ایک آنکھ سے کانا ہوگا۔ دوسری رائے جو بہت کم قبول کی گئی ہے کہ دجال کے بارے میں قرآن مجید کچھ نہیں کہتا اور جو کچھ آیا ہے وہ ناقابل یقین روایات پر مبنی ہے، اس لیے غلط ہے۔ جبکہ تیسری رائے یہ ہے کہ دجال کے حوالے سے جو کچھ تفصیلات احادیث میں آئی ہیں، ان کی بنا پر یہ خبر ہے تو صحیح مگر اس میں تمثیل کے اصول پر ایک فرد کے بجائے ایک فتنہ کی خبر

ہے جو دجل وفریب پر مبنی ایک تہذیب، نظام اور فکر و فلسفہ کی شکل میں ظہور کرے گا۔ اور کل انسانیت کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔ ان لوگوں کے نزدیک دجال دھوکہ اور دجل وفریب پر مبنی وہ مادی تہذیب ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی نفی کر کے زندگی کے حقائق کو سمجھا جاتا ہے۔ اس تہذیب کی صرف ایک آنکھ ہے جو مادیت کو دیکھتی ہے، مگر روحانی اور غیبی حقائق کی منکر ہے۔ یہ اسباب تک محدود ہے اور مسبب الاسباب کی منکر ہے۔ یہ عقلیت کی اسیر ہے اور رسالت کی منکر ہے۔ اس نے موجودہ مادی دنیا کے اسرار و رموز سے تو خوب پردے اٹھائے مگر آنے والی آخرت کی دنیا کو دیکھنے سے قطعاً عاجز ہے۔ مادیت اور اسباب میں اس نے غیر معمولی ترقی کی اور انسانی قوت کو اتنا بڑھا دیا کہ انسانی تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ اس نے دنیا کو اتنا حسین بنا دیا ہے کہ لوگ خدا کی کسی جنت کے طلبگار نہیں رہے۔ یہ دنیا ہی ان کی جنت اور یہی ان کی جہنم ہے۔ شاعر کے الفاظ مستعار لیں تو آج کی دنیا کے متعلق کہا جا سکتا ہے:

تیرا ملنا تر انہیں ملنا
اور جنت کیا اور جہنم کیا

اس کے ساتھ تباہ کن ہتھیاروں، سود پر مبنی عالمی مالیاتی نظام، فحاشی پر مبنی گلوبل میڈیا وغیرہ کے ساتھ اس نے پچھلے چار ہزار برس سے دنیا بھر میں پھیلی ہوئی اور نبیوں کی قائم کردہ تہذیب کی بنیادیں ہلا کر رکھ دی ہیں۔ انسانی جان کی حرمت سے لے کر عفت و عصمت جیسے بنیادی تصورات اس کی نذر ہو چکے ہیں۔ ایمان اور آخرت کے بجائے ہوس زر اور دنیا پرستی آج سب سے بڑی قدر بن چکے ہیں۔ لوگ جنت کو بھول کر دنیا کی جنت کے خواہشمند اور جہنم کو بھول کر دنیا کی محرومی سے لرزاں رہتے ہیں۔ اور اس مقصد کے لیے ہر حد کو عبور کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ یہی اس دجالیت کی سب سے بڑی دین ہے۔

یہ وہ تیسری رائے ہے جسے اب سب سے زیادہ قبول حاصل ہو رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو لوگ دوسری رائے کے حامل ہیں کہ دجال ایک فرد کا نام ہے، ان کی بڑی تعداد بھی اس بات کی قائل ہو چکی ہے کہ دجال کی قوت اصل میں یہی مادی تہذیب اور نظام ہے نہ کہ اسے کوئی مافوق الفطری قوتیں حاصل ہوں گی اور احادیث دجال میں جو کچھ بیان ہوا ہے وہ تمثیل کی زبان میں ہے۔ اس پس منظر میں جب سورۂ کہف کے بیان کردہ فضائل اور اس سورت کے مضامین کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورت ہر اعتبار سے فتنۂ دجال سے تحفظ اور اس کی پھیلائی ہوئی گمراہی سے بچنے کا ایک نور ہے۔

سورۂ کہف کی ابتدائی اور آخری آیات

سورۂ کہف کے مضامین کا اگر جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید کے عمومی طریقے کے مطابق اس سورت کی ایک تمہید ہے اور آخر میں خاتمۂ سورت کی آیات ہیں۔ اس تمہید اور خاتمے میں دین کی بنیادی دعوت یعنی توحید، آخرت کی سزا و جزا اور رسالت کا اثبات کیا گیا ہے۔ ساتھ میں دونوں جگہ یہ بتایا گیا ہے کہ دنیا کی زندگی اللہ تعالیٰ کے نزدیک کتنی بے وقعت ہے۔ تمہید میں ارشاد ہوا:

’’جو کچھ اس زمین میں ہے اسے ہم نے دھرتی کی رونق بنایا ہے تاکہ تمھیں آزمائیں کہ تم میں سے کون (اس رونق کو مقصد زیست بنانے کے بجائے) اچھے کام کرتا ہے۔ اور (رہی یہ رونق تو عنقریب) جو کچھ اس پر ہے ہم اسے ایک صاف میدان بنا دیں گے۔‘‘

(آیت 7-8)

خاتمے میں ارشاد ہوا:

’’اے نبی ان سے کہو کہ کیا ہم تمھیں بتائیں کہ اپنے اعمال کے اعتبار سے سب سے

زیادہ خسارے میں کون لوگ رہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی ساری کاوش دنیا کی زندگی
میں کھو کر رہ گئی اور وہ یہ سمجھتے رہے کہ وہ کوئی بہت اچھا کام کر رہے ہیں۔''

یہ آیات پڑھیے اور بار بار پڑھیے۔ کس لب و لہجے میں دنیا پرستی پر شدید تنقید ہو رہی ہے اور اس کی بے وقعتی واضح کی جا رہی ہے۔ ابتدا اور آخر کی یہی وہ آیات ہیں جن کے یاد کرنے پر صحیح مسلم کی روایت میں فتنۂ دجال سے بچائے جانے کی بشارت دی گئی ہے۔ یہ روایت اگر ٹھیک ہے تو بلاشبہ ان آیات کو حفظ جاں بنانے والا فتنۂ دجال سے محفوظ رہے گا۔ مگر شرط یہ ہے کہ دجال کا وہ دوسرا مفہوم ٹھیک مانا جائے جس کے تحت فتنۂ دجالیت مادی تہذیب کا وہ غلبہ ہے جو ہر خاص و عام کو جنت و جہنم سے بے نیاز کر کے دنیا کے پانے اور کھونے میں مگن کر دے گا۔

سورۂ کہف کے مضامین کا ایک جائزہ

تمہید و خاتمہ کے علاوہ اس سورت میں مجموعی طور پر چار واقعات بیان ہوئے ہیں اور ساتھ ہی قرآن مجید کے طریقے کے مطابق اللہ تعالیٰ کی طرف سے تبصرے بھی کیے گئے ہیں۔ پہلا واقعہ اصحابِ کہف کا ہے۔ دوسرا واقعہ دو آدمیوں کی ایک تمثیل ہے۔ تیسرا واقعۂ موسیٰ وخضر ہے اور چوتھا ذوالقرنین بادشاہ کا قصہ ہے۔

ظاہر ہے میں اس مختصر مضمون میں آیات و واقعات کی تفصیل نہیں کر سکتا۔ میں صرف یہ بتاؤں گا کہ کس طرح ان چاروں واقعات میں اللہ تعالیٰ نے بڑے نمایاں طریقے پر یہ واضح کیا ہے کہ گرچہ یہ دنیا عالم اسباب ہے جس میں اللہ تعالیٰ پردۂ غیب میں رہتے ہیں، لیکن یہ کارخانۂ اسباب اسی کی مرضی و منشا کے مطابق چلتا ہے۔ جس میں خدا کو بھول کر جینے کا انجام بدترین تباہی ہے اور اسے یاد رکھنے کا نتیجہ ابدی کامیابی ہے۔ جو لوگ دنیا کی زندگی کو سب کچھ سمجھ بیٹھے ہیں وہ شدید غلطی پر ہیں اور اس سورت میں اسی غلطی سے لوگوں کو نکلنے کا درس دیا گیا ہے۔ اب آئیے

ایک ایک کر کے ان واقعات کا جائزہ لیتے ہیں۔

اصحابِ کہف کا واقعہ

سب سے پہلے اس سورت میں کچھ نوجوانوں کا واقعہ بیان ہوا ہے جو روم کی بت پرست حکومت کے شہری تھے۔ مگر حضرت عیسیٰ کے مخلص پیروکاروں کی دعوت توحید پر ایمان لا کر شرک سے تائب ہو گئے تھے۔ انھیں یہ اندیشہ تھا کہ بت پرست حکومت کو جب یہ پتہ چلے گا تو وہ انھیں سنگسار کر دیں گے یا بالجبر دوبارہ بت پرست بنا دیں گے۔ رومی سلطنت اتنی بڑی اور اتنی طاقتور تھی کہ اس سے بچ کر بھاگنا بظاہر ناممکن تھا۔ مگر وہ اللہ پر بھروسہ کر کے ایک غار میں جا چھپے۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر یہ کرم کیا کہ انھیں ایک مدت کے لیے سلا دیا۔ ایک صدی سے زیادہ کے اس عرصے میں دنیا بدل کر کچھ سے کچھ ہو گئی۔ قسطنطین نامی مشہور رومی حکمران نے عیسائیت قبول کر لی اور یوں ہر طرف مسیحیت کا غلبہ ہو گیا۔ مگر اس زمانے میں حضرت عیسیٰ کی اصل تعلیمات میں طرح طرح کی تحریفات اور بدعات کا آغاز ہو چکا تھا۔ چنانچہ ایک بحث یہ چھڑ گئی تھی کہ موت کے بعد دوبارہ زندگی کس طرح ممکن ہے۔ یہی وہ زمانہ تھا جب اللہ تعالیٰ نے ان کی ہدایت کے لیے یہ خصوصی اہتمام کیا کہ سوئے ہوئے ان اصحاب کہف کو جگا دیا۔ وہ یہ سمجھے کہ وہ ایک دن سوئے ہیں چنانچہ وہ ڈرتے ڈرتے کھانے کی تلاش میں شہر گئے۔ مگر جب کھانا لینے والے نے دکاندار کو پیسے دینا چاہے تو دکاندار نے اسے پکڑ لیا۔ کیونکہ جو سکہ اس نے دیا تھا وہ بہت پرانا تھا۔ تحقیق ہوئی تو معلوم ہوا کہ یہ تو پرانے زمانے کے لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی قدرت سے عرصے تک سوتے رہے اور ان کو کچھ بھی نہیں ہوا۔ ان کا دوبارہ اٹھنا گویا اللہ تعالیٰ کی طرف سے حیات بعد از ممات کی بحث میں ایک فیصلہ کن رہنمائی تھی۔

یہ واقعہ دو بڑے اہم اسباق اپنے اندر رکھتا ہے۔ ایک یہ کہ اگر خارج میں بدترین ماحول ہو

تب بھی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی مدد کرتے ہیں اور اس میں وہ اسباب کے پابند نہیں ہوتے۔ وہ ماورائے اسباب بھی اپنے بندوں کی مدد کر سکتے ہیں کیونکہ انھوں نے یہ دنیا اسباب کے اصول پر بنائی تو ضرور ہے مگر وہ اس کے پابند نہیں۔ اس سے زیادہ بڑا اور اہم سبق یہ ہے کہ یہ دنیا کی زندگی اللہ تعالیٰ کے نزدیک اصل زندگی نہیں بلکہ وہ زندگی موت کے بعد شروع ہوگی جب سارے مردے دوبارہ اٹھائے جائیں گے۔ اصحاب کہف کا واقعہ اس بات پر یقین کا ایک زندہ ثبوت ہے۔ چنانچہ تہذیب جدید کے اسباب اور دنیا کی رنگینیوں میں کھو کر خدا اور آخرت کو بھول جانے کا رویہ قطعاً درست نہیں۔ بلکہ ہر مشکل کو جھیل کر خدا پر بھروسہ کر کے اس کی پسند کی زندگی گزارنا ہی اصل مقصود ہے۔ تیسرا یہ کہ اسباب کی وجہ سے خدا کو مائنس نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ وہ تو اسباب سے بلند تر ہے اور بار بار مداخلت کر کے یہ بتاتا رہتا ہے کہ یہاں اسباب سے بلند تر ایک ہستی موجود ہے۔

باغ والے کا واقعہ

یہ واقعہ، جیسا کہ پیچھے بیان ہوا ایک تمثیل ہے۔ یہ تمثیل دراصل ان دو گروہوں کی ہے جن کا ذکر اصحاب کہف کے واقعے کے فوراً بعد آیت نمبر 27 تا 31 میں ہوا ہے۔ پہلا گروہ ان غریب، کمزور اور زیادہ تر اصحاب کہف کی طرح نوجوان صحابۂ کرام کا تھا جن کا کل سرمایہ یادِ الٰہی تھی۔ دوسری طرف دنیا کی زیب و زینت پر مر مٹنے والے وہ کفار مکہ تھے جو اللہ کو بھول کر، خواہشات کی پیروی کرتے ہوئے بے اعتدالی کی زندگی گزار رہے تھے۔

آیت 32 سے یہ تمثیل شروع ہوتی ہے۔ اس میں دو گروہوں کی نمائندگی دو افراد کرتے ہیں۔ پہلا فرد سرسبز و شاداب انگور کے دو باغوں کا مالک ہے۔ باغ بھی ایسے کہ ان کے تمام اطراف کھجور کے درخت لگے ہوئے ہیں اور دونوں باغوں کے بیچ میں کھیتی جسے سیراب کرنے کے لیے ان کے درمیان نہر رواں پانی کی نہر موجود تھی۔ ایک ایسے موقع پر جب اس کے باغ

خوب پھل پھول رہے اور پیداوار سے لدے ہوئے تھے اس کی ملاقات اپنے ایک غریب ہم نشین سے ہوئی۔ قرآن نے یہ بیان تو نہیں کیا مگر قرائن سے لگتا ہے کہ اس غریب نے اسے آخرت کی زندگی پر ایمان کی دعوت دی۔ جواب میں اس نے کبر و نخوت کے ساتھ اس ہم نشین پر اپنے مال و دولت، مقام و مرتبے اور اس پر اپنی برتری کا اظہار کیا۔ پھر وہ اسے لے کر اپنے باغ میں گیا اور بڑے فخر و اعتماد سے بولا کہ میں نہیں سمجھتا کہ یہ باغ کبھی ویران بھی ہوگا یا کبھی قیامت آئے گی۔ اگر کبھی ایسا ہوا بھی تو اسے اپنے رب کی طرف سے وہاں بھی بہتر مقام ہی ملے گا۔ ہم نشین نے اسے اس کے کفر و غرور پر کچھ تنبیہ کی اور کچھ سمجھایا۔ اسے بتایا کہ صحیح رویہ یہ ہے کہ انسان نعمت و انعام کی حالت کو عطیہ الٰہی سمجھ کر اس کا شکر گزار بنے، نہ کہ اسے اپنی قوت و صلاحیت کا نتیجہ سمجھ کر تکبر میں مبتلا ہو جائے۔ مگر اس نے نہ سنا نہ سمجھا۔ آخر ایک روز اس کا باغ کسی آندھی اور بگولے کی نذر ہو گیا۔ یوں اس کے حصے میں پچھتاووں کے سوا کچھ نہیں آیا۔

ایک دفعہ پھر اس تمثیل میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ دنیا کی کامیابی کوئی کامیابی نہیں۔ یہ کسی لمحے بھی خاک میں مل سکتی ہے۔ وگرنہ آخر کار موت نے خود انسان کو خاک میں ملا دینا ہے۔ اس کے دھوکے میں آ کر خدا کی یاد اور اس کی ملاقات کو فراموش کر دینا اور دنیا کی حقیر پونجی پر تکبر کرنا سرتاسر نادانی ہے۔ اسی حقیقت کو اس تمثیل کے فوراً بعد ان الفاظ میں کھول کر بیان کیا گیا ہے:

''ان سے دنیا کی زندگی کی مثال بھی بیان کر دو (وہ ایسی ہے) جیسے پانی جسے ہم نے آسمان سے برسایا تو اس کے ساتھ زمین کی روئیدگی مل گئی پھر وہ چورا چورا ہو گئی کہ ہوائیں اسے اڑاتی پھرتی ہیں۔ اور اللہ تو ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ مال اور بیٹے تو دنیا کی زندگی کی (رونق و) زینت ہیں۔ اور نیکیاں جو باقی رہنے والی ہیں وہ ثواب کے لحاظ سے تمہارے پروردگار کے ہاں بہت اچھی اور امید کے لحاظ سے بہت بہتر ہیں۔''، (آیت 46-44)

کفار مکہ کو کچھ تنبیہات کے بعد اگلا واقعہ حضرت موسیٰ کا بیان ہوا ہے۔ یہ غالباً اُس زمانے کا ذکر ہے جب ان کی قوم فرعون کی غلامی میں بدترین مظالم کا شکار تھی۔ ایمان لانے والے ستائے جارہے تھے اور فرعون اور اس کے ظالم ساتھی ہر طرح کی دنیوی فراخی اور کامیابی حاصل کیے ہوئے تھے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو ایک سفر پر بھیجا۔ ان کے ساتھ ان کے ایک نائب یوشع بن نون بھی تھے جو ان کے بعد ان کے خلیفہ اور پیغمبر بنے۔ ان کی ملاقات اللہ کے ایک خصوصی بندے جن کا نام خضر بیان کیا جاتا ہے سے ہوئی۔ ان کے ساتھ حضرت موسیٰ کا سفر شروع ہوا تو تین واقعات پے در پے ایسے پیش آئے جن کی کوئی توجیہہ ممکن نہیں تھی۔ پہلا یہ کہ حضرت خضر انھیں لے کر ایک کشتی پر سوار ہوئے اور اس کشتی میں بلاوجہ سوراخ کر دیا۔ کسی کو یوں مالی نقصان پہنچانا ایک بڑی معیوب حرکت تھی۔ اس سے زیادہ معیوب حرکت انھوں نے آگے چل کر یوں کی کہ ایک لڑکے کو بلاوجہ مار ڈالا۔ اچھوں کے ساتھ برا کرنے کے بعد انھوں نے تیسرا کام یہ کیا کہ بروں کے ساتھ بھلائی کر دی۔ وہ اس طرح کہ ایک بستی والوں نے انھیں کھانا کھلانے سے انکار کر دیا جو اُس زمانے کے لحاظ سے انتہائی معیوب بات تھی، مگر انھوں نے ان لوگوں کے ایک مکان کی گرتی ہوئی دیوار کو بغیر کسی معاوضے کے ٹھیک کر دیا۔

بعد میں حضرت خضر نے حضرت موسیٰ کو بتایا کہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی مرضی سے ہوا۔ حقیقت یہ تھی کہ کشتی غریب ملاحوں کی تھی۔ آگے ایک بادشاہ تمام لوگوں کی کشتیاں چھین رہا تھا۔ مگر ان کی کشتی میں ایک عیب دیکھ کر اس نے ان غریبوں کو چھوڑ دیا۔ یوں یہ چھوٹی تکلیف بہت بڑی محرومی سے بچنے کا سبب بن گئی۔ وہ بچہ جو قتل کیا گیا اس کے آثار یہ تھے کہ اس نے خود بھی کفر وسرکشی میں مبتلا ہونا تھا اور اپنے والدین کو بھی مبتلا کر دینا تھا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس برے بچے

کے بدلے میں انھیں ایک بہتر، نیک وصالح بیٹا دینے کا فیصلہ کیا۔ تقدیر الٰہی میں چونکہ ان کے لیے ایک ہی بیٹا تھا اس لیے پہلے کو لے کر دوسرا بیٹا دیا گیا۔ رہی وہ بستی تو احسان اس بستی والوں پر نہیں بلکہ اس نیک شخص کے یتیم بچوں پر کیا گیا جو اپنا تحفظ خود نہیں کر سکتے تھے۔ ان کے گھر میں ایک خزانہ تھا جو دیوار گرنے کی شکل میں ظاہر ہو جاتا اور دوسرے لوگ اسے لے جاتے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے یہ اہتمام کیا کہ ان کی جوانی تک یہ خزانہ محفوظ کر دیا گیا۔

اس قصے میں بنیادی پیغام یہ ہے کہ یہ دنیا بنا کر اللہ تعالیٰ اس سے غافل نہیں ہیں۔ اسباب کی ڈور ہی سے سہی مگر اسے کنٹرول وہی کرتے ہیں۔ ایسے میں اگر کسی اچھے شخص کے ساتھ کوئی برائی کا معاملہ کسی ناگہانی کی شکل میں پیش آئے تو اسے یہ یقین رکھنا چاہیے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی بہتری ہوگی۔ اور اسی طرح اگر وہ کسی برے کے ساتھ اچھا ہوتا ہوا دیکھے تب بھی یہ اعتماد رکھے کہ اللہ تعالیٰ کی یہ بھلائی اصل میں کسی نیک بندے کے لیے ہی ہے۔

آج کے اس دور میں جب ہر شخص اسباب کو اپنا خدا اور دنیا کو اپنا مقصد حیات بنا بیٹھا ہے، ایسے بندۂ مومن کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ ظاہری حالات سے مایوس اور دلبرداشتہ ہو جائے۔ مومن کا توکل ہمیشہ اللہ پر ہی رہتا ہے۔ وہ اسباب سے اوپر اٹھ کر مسبب الاسباب میں جیتا ہے۔ چنانچہ وہ ہر چیز کے پیچھے خیر ہی دیکھتا ہے چاہے بظاہر اسے اس میں کوئی چیز بری نظر آ رہی ہو۔ چنانچہ خدا پر توکل، بھروسہ، اس سے حسن ظن اور ہر حال میں خدا کی بندگی وعبادت بندۂ مومن کا ہمہ وقتی کام ہونا چاہیے۔ کیونکہ خدا غیب میں رہتے ہوئے بھی اپنے بندوں کا ساتھ دیتا ہے۔ چاہے بظاہر معاملات کتنے ہی برے ہوں، خدا صالحین کو کبھی نہیں چھوڑتا۔

یہاں یہ بات بھی واضح رہے کہ پہلے واقعہ میں ہم نے دیکھا تھا کہ اللہ تعالیٰ صالحین کی مدد کرنے کے لیے اسباب کے خلاف بھی معاملات کرتے ہیں۔ مگر چونکہ یہ دنیا عالم آزمائش ہے

اس لیے ایسا بہت کم ہی کیا جاتا ہے۔ اس واقعے میں یہ بتایا جارہا ہے کہ وہ زیادہ تر بندوں کی مدد اسباب میں رہتے ہوئے ہی کرتے ہیں، گو بظاہر یہ اسباب عارضی طور پر ان کے خلاف ہوں، لیکن اپنے نتائج کے اعتبار سے معاملات کا فیصلہ آخر کار نیک بندوں کے حق میں ہوتا ہے۔

قصۂ ذوالقرنین

اس سورت کے دوسرے واقعے میں ہم نے ان کفار کا معاملہ دیکھا تھا جو مال و اسباب پا کر تکبر اور غفلت میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور اپنے مقام و مرتبے کو اپنے عمل کا نتیجہ سمجھ بیٹھتے ہیں۔ اس سورت میں بیان کردہ چوتھا واقعہ وہ ہے جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ زمانۂ قدیم کا ایک بادشاہ جو اپنے زمانے کی تمام متمدن دنیا کا حکمران تھا کس طرح اسباب پا کر مغرور نہیں ہوا بلکہ اس نے توکل، رحم، ایمان اور انسانی ہمدردی کے ان جذبات کا قدم قدم پر ثبوت دیا جو اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہیں۔ یہ واقعہ قدیم فارس کے حکمران سائرس اعظم کا ہے جسے قرآن مجید میں ذوالقرنین کہا گیا ہے۔ قرآن مجید بیان کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے نہ صرف بادشاہی دی تھی بلکہ عالم اسباب میں اس کے زمانے میں جو کچھ بھی قوت و طاقت کے اسباب موجود تھے، سب اسے عطا کیے گئے تھے۔ اس واقعے میں اس کی تین عظیم فوجی مہموں کا ذکر کیا گیا ہے جن میں وہ مشرق، مغرب اور شمال میں متمدن دنیا کی آخری سمت تک فتوحات کرتا چلا گیا تھا۔ ہر مہم کے آغاز پر بطور خاص اس چیز کا ذکر ہے کہ اس نے اس مہم کے اسباب مہیا کیے۔ یہ اس چیز کا بیان ہے کہ اسباب کا اہتمام کرنا برا ہے، نہ بادشاہی اور ملک و دولت بری چیز ہیں۔ قرآن مجید واضح کرتا ہے کہ اس نے اس اسباب و قوت کا وہ استعمال کیا جو اللہ تعالیٰ کو عین مطلوب تھا۔ پھر خاص طور پر اس کی تیسری مہم کے بارے میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ یاجوج و ماجوج کے ستائے ہوئے لوگوں نے جب اس سے درخواست کی کہ ہم سے کچھ ٹیکس لے لو اور ہمارے اور یاجوج ماجوج کے درمیان ایک رکاوٹ

تعمیر کر دو تو اس نے ایک فاتح ہونے کے باوجود کسی قسم کا ٹیکس نہیں لیا بلکہ اپنے خزانے سے خرچ کر کے ان کے لیے ایک زبردست دیوار بنادی۔ یہ ایک پہاڑی درہ تھا جس کو اس نے لوہے کے تختوں سے پہاڑ کی بلندی تک بند کر دیا۔ پھر اسے مضبوط کرنے کے لیے لوہے کو آگ میں دہکا کر پگھلا ہوا تانبا اس پر انڈیل دیا گیا۔ تاکہ نہ یاجوج ماجوج اسے چڑھ کر عبور کر سکیں نہ اس میں نقب لگا سکیں۔ مگر اس کے ایمان کا عالم یہ تھا کہ یہ اہتمام کر کے بھی اس نے کہا کہ یہ میرے رب کی رحمت سے ہوا ہے۔ گویا اس نے کام کا کوئی کریڈٹ خود نہیں لیا۔

اس واقعے میں یہ اسباق ہیں کہ مال و اسباب اگر کسی کو ملے ہیں تو اسے انھیں عطیہ الٰہی سمجھ کر رب کی رضا اور خلق کی بھلائی کے کاموں میں لگانا چاہیے۔ نہ کہ اپنی بڑائی اور فخر کے اظہار میں اس کو خرچ کرے۔ بلکہ جتنا زیادہ انعام عطا ہوا ہو اتنی ہی عاجزی سے کام لینا چاہیے۔ کیونکہ مال ایک حدیث کے مطابق اس امت کا سب سے بڑا فتنہ ہے۔ چنانچہ دنیا پرستی کے اس دور میں درحقیقت مال ایک عظیم فتنہ بن گیا ہے۔ مگر سورۂ کہف ہمیں یہ بتاتی ہے کہ جب انسان ذوالقرنین کی روش پر چلتا ہے تو وہ بڑے سے بڑا بادشاہ بن کر بھی وہ رویہ اختیار کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہوتا ہے اور جس کے نتیجے میں انسان اس عزت کا مستحق بن جاتا ہے کہ آخری وحی میں قیامت تک کے لیے اس کا ذکر محفوظ کر دیا جائے۔

آنے والی قیامت: انجام کا آغاز (Begining of the End)

4 جنوری 2010 کے دن دبئی میں دنیا کی بلندترین عمارت 'برج الخلیفہ' کا افتتاح ہوا۔ یہ افتتاحی مناظر کمیونیکیشن کے جدید ترین انقلاب کی بنا پر دنیا بھر کے ناظرین نے ٹیلیوژن کے ذریعے سے براہ راست اپنے گھروں میں بیٹھ کر دیکھے۔ برج الخلیفہ کی یہ افتتاحی تقریب جسے دنیا بھر کے کروڑوں لوگوں نے ذوق وشوق سے دیکھا، درحقیقت دنیا کے خاتمے کی بھی افتتاحی (Begining of the End) تقریب تھی۔ یہ بظاہر دنیا کی سب سے بلند عمارت کی تکمیل کا اعلان عام تھا، مگر درحقیقت خدا کی سب سے اعلیٰ تخلیق یعنی کرۂ ارض اور اس کے باسیوں کی زندگی کی تکمیل کا اعلان عام تھا۔ یہ اس بات کا اعلان تھا کہ اہل زمین کی مہلت عمر ختم ہو رہی ہے۔ ان کی ہر تعمیر کو ڈھا دینے کا وقت قریب آ لگا ہے۔ انجام کا آغاز ہو چکا ہے۔ مگر بدقسمتی سے بہت کم لوگوں کو یہ بات معلوم ہو سکی۔ آج کی ملاقات میں اسی موضوع پر تفصیل سے بات کی جائے گی۔

سرزمین عرب کا عظیم انقلاب

یوں تو دبئی میں انسانی ہنر کے شاہکار جگہ جگہ تعمیر ہوئے ہیں، لیکن برج الخلیفہ انسانی تخلیق کا وہ اعلیٰ ترین شاہکار ہے جو انسانی ہنر نے کبھی بھی اس دھرتی کی سطح پر تعمیر کیا ہے۔ یہ ایک 828 میٹر بلند عمارت ہے۔ اس سے قبل دنیا کی بلند ترین عمارت تائیوان میں Taipei 101 کے نام سے بنائی گئی تھی جو 508 میٹر بلند تھی۔ اس طرح برج الخلیفہ سابقہ بلند ترین عمارت سے 320

میٹر بلند ہے جو خود ایک غیر معمولی بات ہے۔ یہ معاملہ صرف برج الخلیفہ پر ہی نہیں رکے گا، بلکہ دنیا کی اگلی بلندترین عمارتوں کی دوڑ بھی اسی سرزمین عرب میں لگی ہوئی ہے۔ دبئی کا نخیل ٹاور، جدہ کا کنگڈم ٹاور اور کویت کا برج مبارک الکبیر وہ عمارتیں ہیں جو اگلے دس برسوں میں تعمیر ہوں گی اور جن میں سے ہر ایک کی بلندی ایک سے دو کلومیٹر کے درمیان ہوگی۔ یعنی معاملہ میٹر سے نکل کر کلومیٹر میں پہنچ جائے گا۔

اس قدر بلند عمارات تعمیر کرنا بچوں کا کھیل نہیں۔ اس کے لیے غیر معمولی اضافی وسائل اور معاشی فراخی کی ضرورت ہے جو اس وقت دنیا میں سب سے بڑھ کر عربوں کو میسر ہے۔ عربوں کی اس مالی آسودگی کا ایک خاص پس منظر ہے۔ آج سے چند دہائی قبل جزیرہ نما عرب صرف ایک بنجر صحرا تھا، جہاں ذرائع آمدنی نہ ہونے کے برابر تھے۔ بکریاں چرانا اور لوٹ مار کرنا لوگوں کا پیشہ تھا۔ اگر حرمین کے مقدس مقامات اور نبی آخرالزمان کی تاریخ اس خطے سے وابستہ نہ ہوتی تو شاید ہم اس علاقے کو اتنا ہی جانتے جتنا صحرائے گوبی کے بارے میں جانتے ہیں۔ یعنی کچھ نہیں جانتے۔ اس بے آب و گیاہ سرزمین میں کچھ عرصے قبل اچانک ایک انقلاب آیا۔ صحرائے عرب میں تیل کا سمندر دریافت ہو گیا۔ دور جدید میں یہ توانائی کا سب سے بڑا ذخیرہ تھا اور اس کے بغیر جدید دنیا عملاً معذور تھی۔ چنانچہ دنیا بھر کی دولت کھنچ کر اس خطے میں آ گئی۔ اور یہاں کے لوگوں کی حالت یکسر تبدیل ہو گئی۔ جن لوگوں نے چند دہائیوں قبل اس علاقے کو دیکھا یا کم از کم اس دور کی تصویریں ہی دیکھیں ہیں وہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ کتنا عظیم اور غیر معمولی انقلاب تھا جس نے لوگوں کا طرز زندگی یکسر بدل دیا۔

اس خطے کی ایک دوسری خاص بات یہ تھی کہ دنیا بھر میں غلامی کے خاتمے کے باوجود یہاں غلامی کا نظام پورے زور وشور سے جاری تھا۔ مگر جب پٹرول کی دولت نے اس خطے کو بین الاقوامی دنیا سے متعلق کر دیا تو یہ ممکن نہیں رہا کہ دنیا بھر میں غلامی ختم ہو اور یہاں غلامی باقی رہے۔ چنانچہ سن

ساٹھ کے عشرے میں یکے بعد دیگرے جزیرہ نمائے عرب کے مختلف ممالک سے حکومتی سطح پر غلامی کے قانون کا خاتمہ کر دیا گیا۔ قطر میں سن 52، سعودی عرب اور یمن میں سن 62، متحدہ عرب امارات میں سن 63 اور عمان میں سن 70 میں غلامی کے خاتمے کا اعلان کیا گیا۔ یوں اگر ایک عورت کسی مرد کی ملکیت تھی اور اس حال میں حاملہ ہوئی کہ وہ لونڈی تھی تو اس نے اپنی بچی کو اس حال میں جنا کہ اس کی بیٹی آزاد عورت بن کر گھر کی مالکہ کے طور پر پیدا ہوئی۔ یہ تبدیلی ایک پہلو سے سماجی تھی جس سے لونڈی غلاموں کی زندگی بدل گئی اور دوسری طرف یہی وہ زمانہ ہے جس میں صرف ایک نسل میں پوری قوم کی زندگی میں ایسا انقلاب آیا کہ ماں نے اگر مفلسی میں پرورش پائی تھی تو اولاد رئیسوں کے ٹھاٹھ باٹھ کے ساتھ پیدا ہوئی۔ سماجی اور معاشی انقلاب کے یہ دو واقعات بظاہر الگ الگ ہیں، مگر یہ ایک ساتھ ہی ظہور پذیر ہوئے اور یہی وہ چیز تھی جو ذخیرۂ حدیث میں قیامت کی سب سے بڑی پیش گوئی کی شکل میں اور ایک انتہائی غیر معمولی واقعے کے طور پر امت کو منتقل کی گئی۔

حدیث جبریل

قرآن کریم میں یہ بات بار بار مختلف حوالوں سے بیان کی گئی ہے کہ فرشتے انسانوں سے غیب میں رہتے ہیں اور ان کا ظہور عام لوگوں کے سامنے نہیں ہوتا۔ یہ اگر کبھی ہوا ہے تو انتہائی غیر معمولی واقعے کے طور پر۔ اس بات کو قرآن مجید کے ایک واقعے کی روشنی میں ہم بیان کرتے ہیں۔

حضرت ابراہیم کی بعثت کے وقت دنیا بھر میں شرک غالب آچکا تھا۔ انہوں نے اپنے زمانے کی تمام متمدن دنیا میں گھوم کر توحید کی صدا دی لیکن ان کے حصے میں صرف تین اہل ایمان آئے۔ ایک بی بی ھاجرہ دوسری بی بی سارہ اور تیسرے بھتیجے لوط۔ لوط علیہ السلام خود ایک پیغمبر تھے جنھیں سدوم (موجودہ اردن اور اسرائیل کے بیچ میں واقع بحر مردار کا علاقہ) کی بستیوں میں بھیجا گیا۔ مگر ان کی قوم شرک سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر جنسی بے راہروی کی آخری حد پر

جا پہنچی تھی۔ چنانچہ مشیت الٰہی کا فیصلہ یہ ہوا کہ اس قوم کو تباہ کر دیا جائے اور ابراہیم کی اولاد میں ایک نئی قوم پیدا کی جائے۔ ان دونوں واقعات کی اطلاع دینے والے فرشتے حضرت ابراہیم کے پاس جب آئے تو مکمل انسانی روپ میں تھے۔ چنانچہ ابتدا میں حضرت ابراہیم انھیں پہچان ہی نہ سکے، مگر بعد میں فرشتوں نے اپنی حقیقت ان پر کھولی اور انھیں حضرت اسحٰق اور یعقوب کی خوشخبری دی۔ ساتھ ہی یہ بتایا کہ وہ قوم لوط کو تباہ کرنے آئے ہیں۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہے کہ فرشتوں کا انسانی شکل میں آ کر مکالمہ کرنا انتہائی عظیم واقعہ ہوتا ہے اور یہ شاذ ہی کبھی رونما ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کی حیات طیبہ میں اس سلسلے کا سب سے اہم واقعہ وہ ہے جب اللہ تعالیٰ کے مقرب فرشتے جبریل علیہ السلام انسانی شکل میں حضور کے پاس آئے اور کچھ سوالات کیے۔ یہ پورا واقعہ بڑی تفصیل سے بخاری و مسلم میں نقل ہوا ہے اور اس روایت کو عام طور پر حدیث جبریل کہا جاتا ہے۔ یہ ایک بڑی تفصیلی روایت ہے جس میں حضور نے حضرت جبریل کے جانے کے بعد صحابہ کرام کو بتایا کہ یہ جبریل تھے جو تم کو تمھارا دین سکھانے آئے تھے۔ حضور کے پاس بیٹھ کر حضرت جبریل نے کچھ سوالات کیے تھے۔ ان میں سے آخری سوال قیامت کی نشانیوں کے بارے میں تھا۔ اس کے جواب میں حضور نے فرمایا تھا کہ قیامت کی ایک نشانی یہ ہے کہ لونڈی اپنی مالکن کو جنے گی اور دوسری نشانی یہ ہے کہ تم دیکھو گے کہ ننگے پاؤں، ننگے بدن پھرنے والے کنگال چرواہے بڑی بڑی عمارتیں بنانے میں ایک دوسرے کا مقابلہ کریں گے۔

یہ حدیث شریف کسی شرح و وضاحت کی محتاج نہیں۔ اس کی تعبیر تو ہر شخص اپنی آنکھوں سے عرب کے صحراؤں میں دیکھ سکتا ہے جہاں دنیا کی بلند ترین عمارتوں کی دوڑ لگی ہے۔ اور جہاں چند عشروں قبل ہی ایسا انقلاب آیا جس میں ایک ہی نسل میں لونڈیوں کی اولادیں اپنے سماجی

مرتبے اور مالی حیثیت کے اعتبار سے مالکن ہوگئیں۔

یہ روایت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کا ایک زندہ ثبوت ہے اور اس دور میں ایک زندہ معجزہ بن کر سامنے آئی ہے۔ یہ ذخیرۂ حدیث میں قیامت کی سب سے بڑی اور سب سے زیادہ غیر معمولی انداز میں منتقل کی جانے والی روایت ہے۔ یہ عین ممکن تھا کہ رسول اللہ اور جبریل علیہما السلام کا یہ مکالمہ تنہائی میں ہوتا اور نبی کریم اس کی خبر دوسروں کو دیتے۔ مگر جبریل امین کے صحابہ کے سامنے آکر مکالمہ کرنے سے مقصود یہی تھا کہ لوگ اس مکالمے کی اہمیت کو سمجھیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس روایت کو نقل کرنے والوں میں دیگر صحابہ کے ساتھ حضرت عمر جیسی شخصیت بھی شامل ہے جن سے منقول روایات کی تعداد بہت کم ہے۔

یاجوج ماجوج کا ظہور

اس روایت میں بیان کی گئی علامت کی مزید اہمیت یہ ہے کہ یہ قیامت کی اس نشانی کے عین ساتھ ظہور پذیر ہوئی ہے جو قرآن مجید میں بیان کی گئی قیامت کی واحد نشانی ہے۔ یعنی یاجوج ماجوج کا ظہور۔ قرآن مجید میں اس نشانی کا بیان اس طرح ہوا ہے:

''یہاں تک کہ وہ وقت آجائے جب یاجوج ماجوج کھول دیے جائیں اور وہ ہر بلندی سے پل پڑیں۔ اور قیامت کا شدنی وعدہ قریب آگیا ہے تو ناگہاں ان لوگوں کی نگاہیں ٹنگی رہ جائیں گی جنھوں نے اس کا انکار کیا ہے۔ وہ (پکاریں گے:) ہائے ہماری بدبختی! ہم اس سے غفلت میں پڑے رہے۔ بلکہ ہم خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنے!

(الانبیا21:97-96)

یاجوج ماجوج کون ہیں، اس کا جواب ہمیں بائبل میں ملتا ہے۔ قرآن مجید کے نزول کے وقت یہ اہل کتاب کے مذہبی لٹریچر کی معروف اصطلاح تھی۔ جس طرح سورۂ کہف میں یہودیوں

کے پوچھے گئے ایک سوال کے جواب میں ضمنی طور پر قرآن مجید نے ماضی کے ایک گروہ کی حیثیت سے ان کا تذکرہ کیا تھا، ٹھیک اسی طرح بائبل میں بھی ان کا ذکر ماضی کی ایک قوم کے طور پر ہوتا ہے۔ اور جس طرح قرآن مجید میں مستقبل میں قرب قیامت کی نشانی کے طور پر ان کا ذکر ہوا ہے، ٹھیک اسی طرح انجیل میں بھی قرب قیامت کی نشانی کے طور پر ان کا تذکرہ ملتا ہے۔

بائبل کے مطابق یہ لوگ حضرت نوح کے تیسرے بیٹے یافث کی اولاد میں سے تھے۔ یہ لوگ تاریخ کے زیادہ تر عرصے میں غیر متمدن اور وحشیانہ طرز زندگی اختیار کیے رہے۔ یہ ابتدا میں شمال کی سمت میں رہے اور پھر وہیں سے دنیا کے مشرق اور مغرب میں دور دراز تک پھیل گئے۔ ان کے بہت سے گروہ رفتہ رفتہ تمدن اختیار کرتے چلے گئے اور یاجوج ماجوج سے ہٹ کر ایک متمدن قوم کے طور پر اپنی ایک جداگانہ شناخت اختیار کرتے گئے۔ یہاں تک کہ دور حاضر میں جب تہذیب کی روشنی دنیا بھر میں پہنچ گئی تو ان کا کوئی بھی گروہ غیر متمدن نہیں رہا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت یاجوج ماجوج نام کا کوئی گروہ دنیا میں موجود نہیں۔ نہ کوئی گروہ اس حیثیت میں اپنی شناخت کراتا ہے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ یورپ، امریکہ اور آسٹریلیا میں مقیم سفید فام، روس کی سرخ اور مشرق اقصیٰ وچین کی زرد اقوام انھی یاجوج ماجوج کی اولادوں میں سے ہیں۔ یہی وہ متمدن اقوام ہیں جن کے ہاتھ میں اس وقت دنیا کی امامت وسیادت ہے۔ پچھلے پانچ سو برسوں میں ان لوگوں نے سامی اقوام سے دنیا کی قیادت کو چھینا اور پھر رفتہ رفتہ علم وہنر میں ترقی کر کے اس مقام پر آگئے کہ دنیا بھر میں اب انہی کا اقتدار قائم ہے۔ انھی یاجوج وماجوج نے سائنس وٹیکنالوجی کا وہ انقلاب برپا کیا جس نے انسانیت کو ایک طرف ترقی کی معراج پر پہنچا دیا اور دوسری طرف خود ماحولیاتی اور اخلاقی آلودگی پیدا کر کے انسانیت کے اپنے وجود کو خطرے میں ڈال دیا ہے۔

مضمون کے آغاز میں عرب کے جس انقلاب کا ذکر ہے وہ دراصل یاجوج ماجوج ہی کا پیدا

کردہ انقلاب ہے۔ وہ ٹیکنالوجی جو پٹرول سے چلنے والی مشینیں پیدا کرے۔ وہ ٹیکنالوجی جو زمین کی تہہ سے پٹرول اور گیس کے ذخائر دریافت کر کے اسے لوہے کی مشین میں استعمال کرنے کے قابل بنائے۔ وہ ٹیکنالوجی جو برج الخلیفہ جیسی بلند عمارات تعمیر کرے، وہ ٹیکنالوجی جو اس عمارت کے افتتاحی مناظر کو براہ راست دنیا بھر کو دیکھنے کا موقع فراہم کرے، انھی یاجوج ماجوج کے پیدا کردہ انقلاب کا نتیجہ ہے۔ دنیا بھر میں عظمت اور قوت کی ہر بلندی اور غلبہ واقتدار کی ہر چوٹی سے اگر کوئی گروہ دنیا پر تاخت کر کے اسے فتح کر رہا ہے تو یہی یاجوج ماجوج کا گروہ ہے۔

ان اقوام نے ایک طرف تمدن اور تہذیب کو سائنسی اور سماجی علوم کی ترقی کی مدد سے اپنے نقطۂ عروج پر پہنچا دیا ہے تو دوسری طرف ان کا یہ سائنسی انقلاب زبردست اخلاقی اور ماحولیاتی فساد کا سبب بن گیا ہے۔ ہم اس اخلاقی فساد کو قدرے تفصیل سے بیان کر دیتے ہیں۔ ماحولیاتی فساد اسی کے ذیل میں آ جائے گا۔

اخلاقی انحرافات اور دورِ جدید کا فساد

انسانی تاریخ میں چار قسم کے اخلاقی انحرافات ہمیشہ انسانوں کی اجتماعی زندگی میں زبردست فساد کا باعث بنے ہیں۔ شرک، جنسی بے راہ روی، معاشی ناانصافی اور انسانوں کا قتل ناحق۔ حضرت ابراہیم سے لے کر حضرت موسیٰ کے زمانے تک قرآن مجید چار اقوام کا ذکر کرتا ہے جو ایسے ہی سنگین جرائم کا شکار تھیں۔ حضرت ابراہیم کی اپنی قوم بدترین شرک کا شکار تھی۔ ان کے زمانے میں پوری متمدن دنیا پر شرک چھا چکا تھا۔ چنانچہ قوم ابراہیم کو تباہ کر دیا گیا۔ حضرت ابراہیم کے بھتیجے حضرت لوط کی قوم بدترین درجے کے جنسی انحراف یعنی ہم جنس پرستی کا شکار تھی۔ چنانچہ ان کی قوم کو اس جرم میں تباہ کر دیا گیا۔ حضرت ابراہیم کی اولاد میں سے حضرت شعیب تھے جن کی قوم زمانۂ قدیم کی ایک عظیم تجارتی شاہراہ کے سنگم پر آباد تھی اور آنے جانے والے قافلوں کا مال ناپ تول

میں ڈنڈی مار کر ہتھیا لیتی تھی۔ جبکہ حضرت موسیٰ کے زمانے میں فرعون بنی اسرائیل کو غلام بنا کر ان سے بیگار لیتا تھا۔ اس کے ظلم کا حال یہ تھا کہ اس نے دو دفعہ یہ حکم دیا کہ بنی اسرائیل میں پیدا ہونے والے ہر نومولود بچے کو قتل کر دیا جائے۔ یہ حکم ظلم و بربریت اور قتل ناحق کی آخری انتہا تھی۔

انسانیت کو اس صورتحال سے نکالنے اور صراط مستقیم کو اس کے سامنے ہمیشہ ایک عملی نمونہ کے طور پر قائم رکھنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کی اولاد سے ایک پوری امت کو اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ فرشتوں کی حضرت ابراہیم کے پاس آمد کا مقصد یہی تھا کہ وہ انھیں حضرت اسحٰق اور حضرت یعقوب کی خوشخبری سنا دیں جو درحقیقت ایک امت کی تاسیس کی خبر تھی۔ حضرت ابراہیم نے اپنے ان دوسرے صاحبزادے حضرت اسحاق اور ان کے بیٹے حضرت یعقوب کو فلسطین میں بسایا۔ حضرت یعقوب کے بیٹے حضرت یوسف کے زمانے میں یہ لوگ مصر منتقل ہو گئے اور تقریباً پانچ صدیوں میں ایک پوری قوم بن گئے۔ حضرت موسیٰ کے ذریعے سے اس قوم کو فرعون مصر کی غلامی سے نجات دی گئی اور تقریباً ڈیڑھ ہزار برس تک یہ لوگ دنیا کی ہدایت کے لیے ایک ماڈل بن کر سامنے رہے۔ وقفے وقفے سے اس قوم پر گمراہی کے دور آتے رہے لیکن اللہ کے نبی ہر دور میں اس قوم کو صحیح راہ کی طرف بلاتے، مگر حضرت عیسیٰ کے زمانے میں ان کی گمراہی اتنی زیادہ بڑھ گئی کہ وہ بحیثیت قوم ناقابل اصلاح ہو گئے۔ چنانچہ اس قوم کو منصب امامت سے معزول کر کے ان پر قیامت تک کے لیے مغلوبیت کی سزا مسلط کر دی گئی۔

اس کے بعد تقریباً پانچ صدیوں تک یہ خدمت حضرت عیسیٰ کی امت کے موحدین سرانجام دیتے رہے۔ جس کے بعد اللہ تعالیٰ نے سرزمین عرب میں حضرت ابراہیم کے بڑے بیٹے حضرت اسماعیل کی نسل سے ایک آخری پیغمبر حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو اٹھایا اور پچھلے پندرہ سو برس سے انھی کی امت کے ذریعے سے دنیا کو سچائی اور حق کا پیغام پہنچ رہا ہے۔ یہ تقریباً تین ساڑھے تین

ہزار برس کی مدت ہے جس میں انسانیت کو راہ دکھانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی اقدامات کیے۔ انبیا و رسل، کتب و صحائف، امم و شرائع غرض ہر چیز سے ان کی رہنمائی کی گئی۔ مگر پچھلے دو سو برسوں میں یاجوج ماجوج کے زیر قیادت انسانیت نے اپنے تمام تر روحانی اور ایمانی سفر کو ایک کونے میں پھینک دیا۔ سب سے پہلے شرک سے ایک قدم آگے بڑھ کر وجود باری تعالیٰ اور یوم آخرت کا انکار کر دیا گیا۔ انسانی تاریخ میں پہلی دفعہ انکار مذہب فلسفیانہ پس منظر اور عملی طرز کے طور پر دنیا میں رائج ہو گیا۔ یہ بھی پہلی دفعہ ہوا کہ دنیا میں تقریباً پون صدی تک کمیونزم کی شکل میں خدا کے وجود کو ماننے اور اس کی عبادت کے خلاف ایک عظیم ریاست یعنی سوویت یونین نبرد آزما رہی۔

خدا کے تقدس کے ساتھ انسانی جان کا تقدس بھی اسی دور میں سب سے بڑھ کر پامال ہوا۔ مشینی دور کی جنگوں نے دنیا میں ایسا فساد مچایا جس کی نظیر تاریخ عالم میں نہیں ملتی۔ انسانوں نے ایسے ہتھیار ایجاد کر لیے جو قتل کرنے کی مشین تھے۔ ایسے ہتھیار استعمال ہوئے جنھوں نے پورے پورے شہر صفحۂ ہستی سے مٹا دیے۔ صرف دو عالمی جنگوں میں کروڑوں لوگ مارے گئے جو کبھی انسانی تاریخ میں نہیں مارے گئے۔ اس کے بعد سے بھی مسلسل چھوٹی بڑی جنگوں میں ان قاتل مشینوں سے لاکھوں کروڑوں لوگ قتل یا معذور ہو گئے۔

اسی دور میں جنسی بے راہ روی میں بھی انسانیت نے سارے ریکارڈ توڑ ڈالے۔ فحاشی، عریانی اور زنا ہر دور میں انسانی معاشروں میں موجود رہا ہے، لیکن یہ واقعہ صرف دورِ جدید میں رونما ہوا کہ یہ ایک طرز زندگی بن گیا۔ عریانی، فحاشی اور زنا کو انسانیت نے جس طرح اس دور میں قبول عام بخشا ہے اس کی مثال اس سے قبل کبھی تاریخ عالم میں نہیں ملتی۔ رسائل و جرائد، سینیما، ٹی وی، فوٹوگرافی، فیشن اور انٹرنیٹ کے ذریعے سے عریانی اور فحاشی کا سیلاب ہے جو ہر گھر میں داخل ہو چکا ہے۔ ان سب سے بڑھ کر عالمی سطح پر قوم لوط کا عمل بھی اب پوری مہذب دنیا میں قبول کیا جا چکا ہے۔

معاشی ناانصافی اور ظلم میں بھی جدید دنیا سرمایہ دارانہ نظام کی شکل میں سب سے آگے تھی۔ مگر بیسویں صدی کے آغاز پر سوویت یونین کے کمیونسٹ انقلاب اور اس کے فروغ کے اندیشے نے سرمایہ داری نظام کو کچھ نکیل ڈال دی اور سود پر مبنی سرمایہ دارانہ نظام کچھ نہ کچھ قابو میں رہا۔ مگر کمیونزم کی شکست نے سرمایہ دارانہ نظام کو ایک بے نتھا سانڈ بنا دیا ہے۔ آنے والے برسوں میں یہ سانڈ گلوبلائزیشن، ملٹی نیشنل کمپنیوں کی اجارہ داری اور سرمایہ دارانہ سوچ کی بنیاد پر غریبوں اور مجبوروں کے استحصال کی وہ تاریخ رقم کرے گا کہ لوگ ماضی کی ہر داستان بھول جائیں گے۔ سود کا عفریت، آبادی کی کثرت، وسائل کی کمی، خوراک کا بطور ایندھن استعمال اور پانی کی کمی کا مسئلہ آنے والے دنوں میں عام لوگوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دے گا۔ دنیا بھر کے سرمایہ دار، طاقتور اقوام اور سود خور انسانیت پر ظلم کی ایک نئی رات کا آغاز کر دیں گے۔

اس اخلاقی فساد کے ساتھ ساتھ یاجوج ماجوج نے ماحولیاتی فساد بھی پیدا کر دیا ہے۔ گلوبل وارمنگ کو دنیا بھر کے سائنسدان آنے والے دنوں میں ایک عظیم خطرہ قرار دے رہے ہیں، لیکن اس کا سبب بننے والے سرمایہ دار اپنی معاشی اور سیاسی قوت کی بنا پر اپنی پالیسیوں کو بے روک ٹوک جاری رکھے ہوئے ہیں۔ جس کے نتیجے میں اگلی ایک صدی میں بظاہر یہ کرۂ ارض انسانوں کی رہائش کے قابل ہی نہیں رہے گا۔

امت مسلمہ کی غفلت

یہ وہ عرصہ تھا جب امت مسلمہ سے امید کی جا سکتی تھی کہ وہ انسانیت کی رہنمائی کے لیے اٹھتی اور اسے قرآن مجید کے بتائے ہوئے سیدھے راستے کی طرف لاتی۔ اس مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی خصوصی نصرت کی۔ بیسویں صدی کے آغاز پر پورا عالم اسلام مغربی طاقتوں کا غلام تھا، مگر اللہ تعالیٰ نے ایسے حالات پیدا ہونے دیے جس کی بنا پر نصف صدی کے اندر اندر دنیا

بھر کے مسلمان آزاد ہوگئے۔ سیاسی غلامی سے بچانے کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے ان مسلمانوں کو اقتصادی غلامی سے بھی بچالیا۔ پٹرول کے سمندر نے پچھڑے ہوئے مسلمانوں کو دنیا کی ضرورت بنادیا۔ سیاسی اور اقتصادی طور پر آزاد یہ مسلمان دنیا کے عین وسط میں شمالی افریقہ، مشرق وسطی، جنوبی ایشیا اور مشرقی ایشیا میں موجود تھے۔ یوں دنیا بھر کے غیر مسلموں تک رسائی کے لیے مسلمان ایک بہترین جغرافیائی مقام پر تھے۔ ان سب پر اللہ تعالیٰ نے ایک انتہائی خصوصی فضل یہ فرمایا کہ بین الاقوامی کشاکش سے بچا کر اندرونی ترقی کا موقع دینے کے لیے مسلمانوں کو سرد جنگ کا وہ وقفۂ امن دیا جس میں مسلمان روس اور مغرب کی باہمی کشمکش کا فائدہ اٹھا کر اپنی داخلی تعمیر، اخلاق اصلاح اور غربت و جہالت کے خلاف بھرپور جنگ کر سکتے تھے۔ جبکہ خارجی طور پر دعوت دین کا کام آسان کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے دو خصوصی انتظامات کیے۔ ایک یہ کہ سائنس کا علم جو انیسویں صدی تک مذہب اور خدا مخالف تھا، بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہی اس میں پے در پے ایسی دریافتیں سامنے آئیں جو یا تو مذہبی معتقدات کے موافق تھیں یا کم از کم ان کے خلاف نہ تھیں۔ یوں سائنسی دور میں پہلی مرتبہ مذہب علمی اور عقلی طور پر ایک قابل قبول نظریہ بن گیا۔ دوسرا یہ کہ دو عظیم جنگوں کی تباہ کاریوں نے بھی انسانی معاشروں پر یہ واضح کر دیا کہ مذہب اور اخلاق کو نظر انداز کر کے محض سائنس کی بنیاد پر زندگی کے مسائل حل کرنا تو دور کی بات ہے، یہ رویہ تو انسانی بقا ہی کو خطرے میں ڈال دینے کا سبب بن رہا ہے۔ یوں مذہب کی عوامی قبولیت کی راہ ہموار ہوئی اور دنیا بھر میں مذہب کی طرف لوٹنے کا عمل شروع ہوا۔

یہ وہ آئیڈیل مواقع تھے جن کو استعمال کر کے دنیا کو دین حق کا پیغام پہنچانا انسانی تاریخ میں سب سے زیادہ آسان ہو چکا تھا۔ بدقسمتی سے مسلم لیڈرشپ نے یہ تمام مواقع ضائع کر دیے۔ سیاست ان کے دماغوں پر ایسی سوار ہوئی کہ پہلے وہ اپنے ملک کے حکمرانوں سے لڑتے رہے۔

پھر سوویت یونین کا نمبر آیا اور اب وہ مغرب سے ٹکرا رہے ہیں۔ دعوت و ہدایت سے غفلت اور سیاسی غلبے کی سوچ پر مشتمل یہ ٹھیک وہی رویہ ہے جس میں بنی اسرائیل جب مبتلا ہوئے تو پہلے بخت نصر اور پھر ٹائٹس رومی کے ہاتھوں خدا کا قہر ان پر نازل ہو گیا اور آخر کار انھیں منصب امامت سے معزول کر دیا گیا۔ مسلمانوں کا ماضی قریب کا ریکارڈ، ان کی فکری اور مذہبی قیادت کا رویہ اور عوام الناس کا ان کی اندھی تقلید کا رویہ صاف بتاتا ہے کہ انھوں نے بنی اسرائیل سے کچھ سیکھنے کے بجائے انھی کے نقش قدم پر چلنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

دین حق کا فیصلہ کن ابلاغ اور اس کے کرنے والے

یہ وہ تفصیلی پس منظر ہے جس میں انسانیت اپنے سفر حیات کے آخری مرحلے میں داخل ہو رہی ہے اور انسانیت کا خاتمہ قریب آ لگا ہے۔ تاہم اس سفر کے خاتمے سے قبل ایک کام ہونا ابھی باقی ہے۔ یہ دین حق کا فیصلہ کن ابلاغ ہے۔ پچھلی صدی میں اجتماعی طور پر مسلمانوں نے ملنے والی اکثر نعمتوں کو گنوا دیا یا کم از کم ان کا فائدہ نہیں اٹھایا۔ اب یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت پر منحصر ہے کہ وہ مسلمانوں کے ایک گروہ قلیل کو استعمال کریں یا پھر غیر مسلموں میں سے کچھ لوگوں کو توفیق دیں کہ وہ اتمام ہدایت اور ابلاغ ہدایت کا وہ آخری فریضہ سرانجام دیں جس کے بعد انسانیت کا فیصلہ ہو جائے گا۔ انسانیت کو یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ انھیں خدا کے سامنے جھکنا ہے یا دنیا پرستی کی زندگی کو ہی اپنا مقصد حیات بنانا ہے۔ انھیں ایمان و اخلاق کو اختیار کرنا ہے یا ظلم و فساد کا راستہ انھیں پسند ہے۔ انسانیت پہلا فیصلہ کرتی ہے تو اسے کچھ مہلت اور مل جائے گی۔ وگرنہ انسانی تاریخ کو ختم کر کے ایک نئی دنیا بسائی جائے گی جو ہر ظلم اور ہر ناانصافی سے پاک ہوگی۔

دین حق کے ابلاغ کے اس مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ نے چند خصوصی اہتمام کیے ہیں۔ ایک یہ کہ انفارمیشن ایج کا آغاز کر دیا ہے۔ جس کے ذریعے سے کم لوگ بھی دین حق کے ابلاغ کی وہ خدمت سرانجام دے سکتے ہیں، جس خدمت کو ساڑھے تین ہزار برس تک ایک پوری امت سر

انجام دیتی رہی ہے۔ پھر مسلمانوں کے دورِ زوال میں نبی عربی کی لائی ہوئی بنیادی ہدایت یعنی ایمان واخلاق اور آسمانی شریعت پر تقلید وجمود کے خیالات اور عجمی توہمات کے جو پردے پڑ گئے تھے وہ اٹھا کر پھینک دیئے گئے ہیں۔ آج دین اپنی اصل شکل میں ہر قسم کی ملاوٹ سے پاک اور اپنی پوری حجت کے ساتھ ہمارے پاس موجود ہے۔ قرآن پاک کی دعوت اور نبی عربی کی ہدایت کو ہر طرح کے فرقہ وارانہ تعصّبات سے بلند ہو کر بیان کرنے والے اہل علم سامنے آ چکے ہیں۔

ایک آخری بات

انسانوں کے لیے دنیا کی زندگی اور اس کے مسائل ہمیشہ بنیادی اہمیت کے حامل رہے ہیں۔ گھر، بچے، شادی، کیریئر، عشق ومحبت، غربت وبیماری...... یہی چیزیں ہر دور میں انسانوں کی خوشی اور غم کا باعث بنتی رہی ہیں۔ تاہم اس دنیا کے خالق ومالک اور پروردگار عالم نے اپنے جو رسول اور اپنی جو کتابیں اس دنیا میں بھیجیں ان کے نزدیک اس دنیا سے کہیں زیادہ آنے والی دنیا اور اس کی خوشی اور غم اہمیت کے حامل ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے آخری رسول حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم اور اس کی آخری کتاب قرآن مجید کا تو خصوصی موضوع ہی قیامت اور اس کے بعد قائم ہونے والی دنیا سے لوگوں کو خبردار کرنا ہے۔ آخرت کے دن رب العالمین کے حضور پیشی سے لوگوں کو خبردار کرنا ہی مقاصد نبوت میں سے ایک بنیادی مقصد ہے۔ اسی مناسبت سے قرآن مجید میں جگہ جگہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے نذیر کی صفت بیان ہوئی ہے۔ عام طور پر اس کا ترجمہ ڈرانے والا کیا جاتا ہے۔ تاہم قرآن مجید میں یہ جس مفہوم میں استعمال ہوا ہے وہاں اس سے مراد کسی خوفناک چیز سے ڈرانا نہیں بلکہ ایک اہم ترین حقیقت سے خبردار کرنا ہے۔ میرا اپنے اس مضمون میں قیامت کے قرب کے حوالے سے تفصیلات بیان کرنے کا مقصد لوگوں میں خوف وہراس اور ڈپریشن پیدا کرنا نہیں، بلکہ اصل مقصد یہ ہے کہ جس دنیا کی خاطر لوگ اللہ اور اس کے حضور پیشی کو فراموش کیے ہوئے ہیں، اس کی تباہی کی خبر لوگوں کو دی جائے اور یہ بتایا جائے کہ

اس کے ساتھ ایک نئی دنیا میں حقیقی اور ابدی زندگی شروع ہو جائے گی۔

یہ نئی دنیا نعمت وعذاب کے پہلو سے آخری درجے پر ہوگی۔ نعمت کے پہلو سے یہ دنیا ہر قسم کے عیب اور کمزوری سے خالی ہوگی۔ یہ ایک ابدی دنیا ہوگی جہاں نیک لوگوں کے لیے زندگی کے ہر مسئلے کو ختم کر دیا جائے گا۔ موت، بڑھاپا، بیماری، معذوری محتاجی، غربت، مایوسی، ڈپریشن، دکھ، پریشانی غرض زندگی ہر مسئلے سے خالی ہوگی۔ جوانی، صحت، طاقت، عزت، حسن، رزق اور نعمتوں کی فراوانی ان اہل ایمان کا صلہ ہوگی۔ جبکہ دوسری طرف اللہ کے نافرمانوں کی زندگی ہر قسم کی خوشی سے محروم اور سراپا دکھ والم ہوگی۔ انھیں لمحے لمحے میں اپنے گناہوں کے اعتبار سے عذاب جھیلنا ہوگا۔ انھیں معلوم ہو جائے گا کہ ماضی کی جس دنیا کے لیے انھوں نے اپنے رب کو فراموش کیا وہ سوائے دھوکے اور فریب کے کچھ نہیں تھی۔ اس دھوکے کی خاطر انھوں نے ابدی خسارے کا انتخاب کر لیا۔

مگر اس ابدی نعمت وعذاب سے قبل ہم سب کے پاس فیصلے کا ایک آخری موقع موجود ہے۔ اب انسانیت کو بھی آخری فیصلہ کرنا ہوگا اور ہم میں سے ہر شخص کو بھی آخری فیصلہ کرنا ہوگا۔ آخرت یا دنیا، دعوت یا نفرت، خدا پرستی یا نفس پرستی، پیروی رسول یا فرقہ واریت، جذبات وتعصّبات یا علم ودعوت۔ ہم جو فیصلہ کریں گے وہ ہمارے ابدی مستقبل کا تعین کر دے گا۔ یہ عظیم موقع ہے۔ اس وقت خدا اور سچائی کا ساتھ دینے کا مطلب یہ ہے کہ جو عزت نبی آخر الزماں کے اصحاب کرام کو ملی تھی وہی آپ کی امت کے آخری حصے کے اس قلیل گروہ کو مل جائے گی۔ دنیا کا اختتام شروع ہو گیا ہے۔ ہم سب کو اس کی تیاری کر لینی چاہیے۔ ہم سب کو فیصلہ کر لینا چاہیے۔ کیونکہ قیامت ابھی قائم نہیں ہوئی۔ موت ابھی نہیں آئی۔ مگر جلد ہی موت آنے والی ہے۔ ہر فرد کی بھی اور کل انسانیت کی بھی۔ انسانیت کی یہی موت قیامت ہے۔

یاجوج ماجوج کی حقیقت

کچھ عرصے قبل میں نے یاجوج ماجوج کے حوالے سے ایک مضمون لکھا تھا جو رسالے کے قائین کی نظر سے گزر چکا ہے۔ اسی موضوع پر میں نے اپنے ہفتہ وار درس میں گفتگو بھی کی تھی۔ اس گفتگو پر ایک صاحب علم دوست نے تحریری تبصرہ کیا تھا جس میں بعض اعتراضات اٹھائے گئے تھے۔ میں نے ایک خط میں ان اعترضات کا جواب دیا ہے جس میں علم حدیث اور یاجوج ماجوج کے حوالے سے بہت سی ایسی چیزیں زیر بحث آگئی ہیں جن کا مطالعہ قارئین کے لیے دلچسپی اور افادیت سے خالی نہیں ہوگا۔ آج کی ملاقات میں یہ خط آپ کی خدمت میں پیش ہے۔ تاہم خط کے ذاتی انداز کو بدل کر اسے ایک مضمون کی طرح مرتب کر دیا گیا ہے۔

میرا خط

''میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے میری معروضات کو سنا اور از راہِ عنایت اُس پر اپنے تحریری تبصرے کے لیے بھی کچھ وقت نکالا۔ آپ کی اس توجہ اور عنایت کے لیے میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں۔ آپ نے مجموعی طور پر میری گفتگو سے اتفاق کیا ہے۔ یہ چیز بھی اس طالب علم کے لیے حوصلہ افزائی کا باعث ہے۔ اس لیے کہ آپ جیسا علمی ذہن کا شخص اگر دعوتِ دین کے بارے میں میرے نقطۂ نظر کو درست سمجھتا ہے تو میں اسے بڑی سعادت کی بات سمجھتا ہوں۔

جن امور پر آپ نے اپنے اختلاف کا اظہار کیا، میں یقین دلاتا ہوں کہ میرے دل میں اُن

کے حوالے سے بھی کوئی ناگواری پیدا نہیں ہوئی۔ اس لیے کہ ہم طالبِ علموں کی اصلاح کرنا آپ جیسے اہلِ علم کی ذمہ داری ہے۔ آپ نے جن باتوں کی طرف توجہ دلائی ہے ان کی اہمیت میں سمجھتا ہوں۔ البتہ میری معروضات کے حوالے سے جو باتیں وضاحت طلب ہیں، ان کا جواب دینا میں اپنی ذمہ داری سمجھتا ہوں۔ اس پس منظر میں کچھ گزارشات پیش خدمت ہیں۔

احادیث کے متعلق میرا نقطہ نظر

آپ کی پہلی بات ایک حدیث سے متعلق ہے۔ اس کا جواب دینے سے قبل میں حدیث سے متعلق اپنا اصولی نقطۂ نظر بیان کرنا چاہتا ہوں۔ محدثین نے احادیث کو قبول کرنے کے جو معیارات بیان کیے ہیں، میرا ان پر کامل اطمینان ہے اور کوئی روایت اگر ان پر پوری اتر جائے تو پھر اس سے انحراف اور اسے قبول کرنے سے انکار کرنا میں ایمان کے منافی سمجھتا ہوں۔ البتہ کوئی روایت اگر ان اصولوں پر پوری نہ اتر رہی ہو تو پھر اہل علم ہمیشہ ایسی روایات پر کلام کرتے رہے ہیں اور آج بھی کریں گے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ پھر اس طرح کی روایات کی نسبت خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف مشکوک ہو جاتی ہے۔ اور ایک غلط اور مشکوک بات کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کرنے سے کہیں بہتر ہے کہ محتاط رویہ اختیار کیا جائے۔ احادیث کے بارے میں یہی راستہ مجھے سب سے زیادہ محفوظ لگتا ہے۔

یایوج ماجوج سے متعلق روایت کی حقیقت

اس اصولی بات کے بعد اب آیئے آپ کے اعتراض کی طرف۔ آپ اپنے خط میں لکھتے ہیں:

''(لیکچر میں) یاجوج ماجوج کے بارے میں روایات کو کہانیاں کہہ کر ان کا مضحکہ اڑایا گیا۔ جس روایت کی طرف سرسری طور پر اشارہ کیا گیا وہ اگرچہ ضعیف ہے لیکن دیگر صحیح روایات میں بھی یاجوج ماجوج کے عجیب وغریب احوال ملتے ہیں۔ بلاتخصیص تمام روایات کو کہانیاں

قرار دینا درحقیقت سارے ذخیرۂ حدیث کو مشکوک بنا دینے کے مترادف ہے۔''

آپ کا یہ بیان انصاف پر مبنی نہیں کہ میں نے 'بلا تخصیص تمام روایات کو کہانیاں قرار' دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں نے اپنی گفتگو میں صرف اور صرف ایک روایت کا تذکرہ کیا تھا اور اسی کے ضمن میں کہانی کا لفظ استعمال کیا تھا۔ اس لیے انصاف کا تقاضا ہے کہ گفتگو کو صرف اسی ایک روایت تک محدود رکھا جائے جس کی طرف لیکچر میں اشارہ کیا گیا تھا۔ اس کے بارے میں گرچہ آپ نے خود بھی بیان کر دیا ہے کہ یہ ایک ضعیف روایت ہے۔ لیکن میں چاہوں گا کہ اس ضمن میں 'قصص القرآن' کے مصنف مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی نے دیگر اہل علم کے حوالے سے جو کچھ لکھا ہے وہ آپ کے سامنے پیش کردوں تا کہ آپ کو اندازہ ہو جائے کہ اس روایت کے لیے کہانی کے الفاظ اس ناکارہ کے نہیں تھے بلکہ اس 'جرم' میں بڑے بڑے نام شامل ہیں۔ مولانا اپنی کتاب میں پہلے اس روایت کا متن بیان کرتے ہیں:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یاجوج وماجوج روزانہ ذوالقرنین کی سد (دیوار) کو کھودتے رہتے ہیں اور جب سورج نکلنے کا وقت قریب ہو جاتا ہے تو آپس میں کہتے ہیں کہ اب کام ختم کرو اب یہ اس قابل ہوگئی ہے کہ کل تم اس کو کھود کر گرا سکو گے، مگر جب وہ اگلے روز پھر اس کام پر واپس آتے ہیں تو سد کو اصلی حالت سے بھی زیادہ مضبوط اور مستحکم پاتے ہیں، یہ اسی طرح ہوتا رہتا ہے مگر جب ان کی معین مدت کا وقت پورا ہو جائے گا اور اللہ تعالیٰ کو یہ منظور ہوگا کہ اب وہ انسانی دنیا پر چھا جائیں تو اس روز بھی سابق کی طرح اس کو کھودیں گے اور جب سورج نکلنے کا وقت قریب ہوگا تو کام لینے والے کام کرنے والوں سے کہیں گے اب واپس جاؤ کل انشاء اللہ اس کو کھود کر برابر کر سکو گے، اور آج چونکہ انشاء اللہ کہہ دیا اس لیے جب واپس آئیں گے تو اپنی محنت کو درست پائیں گے اور اس وقت وہ باقی محنت کر کے سدّ کو گرا دیں گے اور لوگوں پر نکل پڑیں گے۔ اور تمام روئے زمین کا پانی پی جائیں گے اور لوگ ان کے خوف

سے قلعوں اور پناہ گاہوں میں چھپ جائیں گے پھر وہ دنیا کو مغلوب سمجھ کر آسمان پر تیر پھینکیں گے کہ خدا اور عالمِ بالا سے جنگ کر کے اس کو بھی مغلوب کریں، اللہ تعالیٰ ان کے تیروں کو خون آلود کر کے واپس کرے گا تو وہ سمجھیں گے کہ ہم عالمِ بالا پر بھی غالب آ گئے، پھر اللہ تعالیٰ ان کی گردن میں گلٹیاں پیدا کر دے گا جس سے وہ خود بخود مر جائیں گے۔ (ترمذی سورۂ کہف)''، (قصص القرآن، جلد سوم، ص 214-215)

یہ تو روایت کا متن ہو گیا۔ اب دیکھیے کہ مولانا سیوہاروی صاحب اہل علم کے حوالے سے اس پر کیا تبصرہ کرتے ہیں۔ جو الفاظ انڈر لائن ہیں وہ میں نے کیے ہیں:

''مگر ترمذی نے اس حدیث کو بیان کر کے حدیث کی حیثیت پر یہ حکم لگایا ہے کہ:

'یہ حدیث حسن غریب ہے اور ہم اس طریقہ سند سے ایسی ہی اچنبھی باتیں جانا کرتے ہیں۔'

یعنی ان (امام ترمذی) کے نزدیک یہ روایت اپنے اعتبار سے منکر اور اچنبھی (نرالی) روایت ہے اور حافظ عماد الدین ابنِ کثیر اس روایت کو نقل کر کے اس پر یہ حکم لگاتے ہیں:

اس حدیث میں مضمون کے لحاظ سے نکارت (اجنبی پن) ہے اور اس کو مرفوع کہنا یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرنا غلط ہے، اصل بات یہ ہے کہ ٹھیک اسی قسم کی ایک اسرائیلی کہانی کعب احبار سے منقول ہے اور اس میں بھی یہ سب باتیں اسی طرح مذکور ہیں، معلوم ایسا ہوتا ہے کہ حضرت ابوھریرہؓ نے جو کہ اکثر کعب احبار سے اسرائیلی قصّے سنا کرتے تھے اس کو ایک اسرائیلی کہانی کے طور پر بیان کیا ہوگا جس کو نیچے کے راوی نے یہ سمجھا کہ حضرت ابوھریرہؓ کی یہ روایت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے درحقیقت یہ راوی کا وہم ہے اور کچھ نہیں ہے۔

اس حدیث کے متعلق میں نے یہ جو کچھ کہا ہے میرا اپنا خیال ہی نہیں ہے بلکہ امامِ حدیث امام احمد بن حنبل بھی یہی فرماتے ہیں۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۱۰۵)''، (قصص القرآن، جلد سوم، ص215)

ان اہل علم کے تبصروں کے بعد مولانا اگلی سطر میں خود یہ تبصرہ کرتے ہیں:

''ترمذی، ابنِ کثیر اور امام احمد کی ان تصریحات کے بعد اس روایت کی حیثیت ایک اسرائیلی قصّے سے زیادہ نہیں رہ جاتی۔'' (قصص القرآن، جلد سوم، ص215)

آپ غور فرمائیے کہ اس روایت کو کس سطح کے لوگ قول رسول سمجھنے کے بجائے ایک اسرائیلی کہانی اور قصہ قرار دے رہے ہیں۔ کہانی کے الفاظ میرے نہیں ہیں، یہ ان لوگوں کے ہیں جن کے اکابر اہل علم ہونے میں آپ کو بھی کوئی شک نہیں ہوسکتا۔ کیا آپ ان لوگوں کے بارے میں بھی یہی رائے قائم کریں گے کہ یہ روایات کا مضحکہ اڑاتے ہیں۔ ہرگز ایسی کوئی بات نہیں ہے، بلکہ یہ ایک غلط بات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہونے سے روکنے کی ایک دیانتدارانہ کوشش ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کوئی شخص ان اہل علم سے اختلاف کرے لیکن ان پر یہ الزام لگانا کہ یہ روایات کا مضحکہ اڑا رہے ہیں نہ صرف 'قول سدید' کے قرآنی حکم کی کھلی خلاف ورزی ہوگی بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اخلاقی معاملات میں آخری درجہ میں غیر محتاط ہونے کی صریح علامت بھی ہوگی۔

اختلاف رائے کا غلط طریقہ

آپ غور فرمائیے کہ کسی شخص کے بارے میں یہ رائے دینا کہ وہ روایات کا مضحکہ اڑا رہا ہے اس کے ایمان اور دینی حیثیت پر کتنا شدید حملہ ہے۔ کم از کم آپ جیسے اہل علم سے مجھے توقع تھی کہ اس نوعیت کی کوئی بات کرنے سے قبل آپ متعلقہ شخص سے اس کی بات کی دلیل پوچھتے، بات پر سنجیدگی سے غور کرتے اور وگرنہ خود ہی تحقیق فرمالیتے۔ دوسروں کے بارے میں بلا تحقیق اس

نوعیت کی غیر محتاط گفتگو کرنا بدقسمتی سے ہماری مذہبی روایت کا ایک حصہ بن چکا ہے، جس کا شکار آپ جیسے صالح لوگ بھی ہوجاتے ہیں۔ مگر اس تعلق خاطر کی بنیاد پر جو مجھے آپ سے ہے، میں ایک صحیح حدیث کی روشنی میں آپ کے سامنے اس معاملے کی سنگینی کو واضح کرنا چاہتا ہوں:

''جس نے کسی آدمی کو کفر کی نسبت سے بلایا یا یہ کہا کہ تم اللہ کے دشمن ہو اور وہ ایسا نہ ہوا تو یہ اسی کی طرف پلٹے گا۔'' (مسلم، کتاب الایمان، رقم 93)

ہوسکے تو اس حدیث میں بیان کردہ اصول کی روشنی میں اپنے کلام پر از سرِ نو غور فرمالیجیے، کیونکہ یہ بات بہت دور تک جا رہی ہے۔ باقی اپنا معاملہ یہ ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین اور آپ کی دعوت کو بے کم و کاست لوگوں تک پہنچانے کا مشن اختیار کیا ہے اور اس راہ میں ہر طرح کی باتیں سننے کے لیے تیار ہوں۔

غیروں سے بھی چھوٹا نہ کوئی ناوک دشنام
اپنوں نے بھی چھوڑی نہ کوئی طرز ملامت
اِس عشق نہ اُس عشق پر نادم ہے مگر دل
ہر داغ ہے اس دل میں بجز داغ ندامت

ضعیف اور موضوع روایات کا کلچر

میں تو اپنے نبی کے دفاع کے لیے اور ان کی طرف کسی غلط بات کی نسبت کو روکنے کے لیے اخبار آحاد کے معاملے میں بہت سختی کے ساتھ محدثین کے اصولوں کی پیروی کرتا ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے اہلِ علم بالخصوص برِّصغیر کے اہلِ علم کا رویہ پچھلی کئی صدیوں میں یہ بن چکا ہے کہ اخبارِ آحاد کے نام پر جو کچھ ان کے سامنے آتا ہے وہ اس کے سند و متن کو جانچے پرکھے بغیر اسے قولِ

رسول کے طور پر پیش کر دیتے ہیں۔آج تک ہمارے بڑے بڑے علما کا حال یہ ہے کہ وہ ایک سانس میں قرآن کی آیت پڑھتے ہیں اور پھر اسی سانس میں پورے یقین و اعتماد کے ساتھ کوئی ضعیف یا گھڑی ہوئی روایت بیان کر دیتے ہیں۔اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ دین کے نام پر بہت سی ایسی باتیں عوام وخواص کے درمیان پھیل گئی ہیں جن کی کوئی حقیقت و بنیاد نہیں۔ جو بے چارہ، محدثین کے اپنے بیان کردہ مسلمہ معیارات پر، کسی روایت کی غلطی واضح کر دے، اس کی شامت آجاتی ہے۔مگر لوگ یہ نہیں سوچتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کسی کمزور بات کی نسبت کرنا کتنی بڑی جسارت ہے۔ میرے نزدیک تو یہ رویہ انتہائی نامناسب ہے۔خاص کر جہنم کی ان وعیدوں کی بنا پر جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جھوٹ منسوب کرنے کے ضمن میں وارد ہوئی ہیں، یہ طریقہ ایک بہت بڑی جسارت ہے۔ میرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے صرف وہی بات کہنی چاہیے جس کے بارے میں سند ومتن کے کسی پہلو سے کوئی اعتراض وارد نہ ہوتا ہو۔میرے نزدیک علما کو اُس اصول کو بہت سختی کے ساتھ اختیار کر لینا چاہیے جو اصول حدیث کے سب سے بڑے امام خطیب بغدادی نے اپنی کتاب ’الکفایہ‘ میں بیان کیا ہے:

> ’’خبر واحد اُس صورت میں قبول نہیں کی جاتی جب عقل اپنا فیصلہ اُس کے خلاف سنا دے؛ وہ قرآن کے کسی ثابت اور محکم حکم کے خلاف ہو، سنت معلومہ یا ایسے کسی عمل کے خلاف ہو جو سنت کی طرح معمول بہ ہو؛ کسی دلیل قطعی سے اُس کی منافات بالکل واضح ہو جائے۔‘‘، (الکفایہ فی علم الروایہ، صفحہ 432)

یاجوج ماجوج سے متعلق ایک سوال

اس خاص حدیث پر ایک سوال اور پیدا ہوتا ہے۔ یہ سوال عقلی نوعیت کا ہے، مگر خطیب بغدادی کی عبارت سامنے آنے کے بعد اتنی اجازت تو بہر حال مجھے ملنی چاہیے کہ میں کوئی عقلی

سوال اٹھا سکوں۔ یاجوج ماجوج کے بارے میں اتنی بات تو سب لوگ مانتے ہیں کہ وہ انسانی نسل ہی سے تعلق رکھتے ہیں، وہ اسی کرۂ ارض پر رہتے ہیں اور کوئی خلائی مخلوق نہیں ہے۔اس بات کو ماننے کے بعد کیا یہ عقلی سوال پیدا نہیں ہوتا کہ سرِ دست یاجوج ماجوج کہاں پائے جاتے ہیں؟ آج سے پچاس برس قبل اس بات کا یہ جواب دیا جاتا تھا کہ لوگوں نے ابھی پوری دنیا کہاں دیکھی ہے؟ لیکن آج یہ جواب بے معنیٰ ہو چکا ہے۔آج اس کرۂ ارض کا گوشہ گوشہ، اس کے پہاڑ، صحرا، سمندر اور اس کا ہر ہر نشیب و فراز کھنگالا جا چکا ہے۔ خلا میں موجود ہزاروں سٹیلائٹ زمین کے چپے چپے کی نگرانی کر رہے ہیں اور زمین کا کوئی گوشہ بھی ان کی نظروں سے پوشیدہ نہیں ہے۔سوال یہ ہے کہ یاجوج ماجوج نامی وہ خاص گروپ جس کا ذکر زیر بحث روایت میں آیا ہے اور جس کی آبادی لاکھوں نفوس سے کم انسانوں پر مشتمل تو ہو نہیں سکتی، اس دنیا میں کہاں موجود ہے؟ اس کا جواب بھی کچھ عرصہ قبل ایک صاحب نے یوں دیا تھا کہ یاجوج ماجوج اٹلانٹک کے برفانی سمندر کے اندر برف کی تہوں میں چھپے ہوئے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ یہ جواب بھی بہت سے لوگوں کو مطمئن کر دے، مگر کیا کیجیے کہ احادیث میں جن لوگوں کا ذکر ہے وہ انسان ہیں، مچھلیاں نہیں جو برف کے اندر پانی میں تیرتی رہتی ہوں۔

برادرم معاملہ یوں نہیں کہ یاجوج ماجوج سے متعلق یہ مروجہ تصور خلافِ عقل ہے بلکہ درحقیقت یہ تصور خلافِ واقعہ ہے۔آپ کے نزدیک اگر یہ کم فہمی ہے تو ازراہِ کرم میرے اوپر بیان کردہ سوال کا جواب دے دیجیے۔اور اگر یہ بات واقعی خلافِ واقعہ ہے تو سوچیے کہ کسی ایسی خلافِ واقعہ بات کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کرنا کتنی بڑی جسارت ہے۔ باقی جو کچھ دیگر روایات میں یاجوج ماجوج سے متعلق آیا ہے میں نے اس پر اپنی تقریر میں کوئی گفتگو نہیں کی تھی۔ وہ چاہے عجیب بھی ہو، مگر اس کے عجیب ہونے کی بنا پر میں احادیث کو چھوڑنے کو

درست نہیں سمجھتا۔ البتہ ان کا مدعا و مفہوم ہر دور میں اہل علم متعین کرتے رہے ہیں، آج بھی یہ کام کیا جائے گا۔ جو بات بھی کہی جائے گی علم اور دلیل کی روشنی میں اس کا جائزہ لیا جائے گا۔ خود صاحب 'قصص القرآن' نے یاجوج ماجوج کی بحث میں بخاری و مسلم کی اس مشہور روایت پر اہل علم کی آرا نقل کی ہیں جس میں حضور کے خواب کے حوالے سے یہ بیان کیا گیا ہے کہ یاجوج ماجوج کی دیوار میں ایک سوراخ ہو گیا ہے۔ اس کو پڑھنے سے آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ پیش گوئیوں کے معنی متعین کرنے میں اہل علم کس طرح مختلف الآرا ہو جاتے ہیں۔

کوئی بات اگر ناگوارِ خاطر گزری ہو تو معذرت کا خواستگار ہوں۔

قیامت کی سزا جزا کے ضابطے

سورۂ توبہ اور قیامتِ صغریٰ

قرآن مجید اللہ کے آخری نبی اور رسول کی داستانِ انذار ہے۔ یعنی آپ بحیثیت رسول سرزمین عرب میں مبعوث ہوئے اور یہاں رہنے والے دو اہم گروہوں یعنی بنی اسماعیل اور اہل کتاب کو دعوت حق دی۔ ربع صدی سے کچھ کم مدت میں آپ نے بنی اسماعیل جن کی قیادت قریش کے ہاتھ میں تھی اور اہل کتاب کے دو گروہوں یعنی یہود و نصاریٰ پر اتمام حجت کر دیا۔ یعنی حق کی دعوت انھیں آخری درجہ کی شرح و وضاحت کے ساتھ پہنچا دی۔ قرآن مجید اسی دعوت، انذار، تبشیر اور اتمام حجت کی داستان ہے۔ جس کے بعد اللہ تعالیٰ کا وہ قانون نافذ ہو گیا جو رسولوں کے باب میں ہمیشہ سے اس کی سنت رہا ہے۔ یعنی کفار پر عذاب کا اور ماننے والوں کے لیے غلبہ و نجات کا فیصلہ ہو گیا۔ سورۂ توبہ اسی فیصلہ کا اعلان ہے۔ یہ گویا وہ قیامت صغریٰ ہے جو سرزمین عرب میں برپا ہوئی اور سورۂ توبہ اسی قیامت کی ایک روداد ہے جس سے ہم یہ اخذ کر سکتے ہیں کہ روز قیامت اللہ تعالیٰ مختلف انسانی گروہوں کے ساتھ کیا اور کس طرح معاملہ کریں گے۔ جو لوگ اس کی عملی تصویر دیکھنا چاہتے ہیں وہ میرے ناول ''جب زندگی شروع ہوگی'' میں ایک تمثیل کی شکل میں اسے دیکھ سکتے ہیں۔

سورہ توبہ: فیصلہ رب کی سورت

اب آیئے ایک ایک کر کے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس سورت میں کیا مضامین بیان ہوئے ہیں اور کس طرح وہ رہنمائی کرتے ہیں کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ انسانیت کے ساتھ کیا معاملہ فرمائیں گے۔خیال رہے کہ سورۂ توبہ قرآن مجید کی دیگر تمام سورتوں کی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی داستانِ انذار کے ایک مرحلے میں نازل ہوئی ہے۔ یہ گرچہ آخری مرحلہ ہے جس میں فیصلہ سنایا جارہا ہے، لیکن ساتھ ساتھ لوگوں کے احوال، اقوال، مطالبات، معاملات، رویے، غلطیاں، گمراہیاں وغیرہ سب زیر بحث ہیں۔اور قرآن مجید ایک زندہ کتاب کے طور پر ان پر تبصرہ کر رہا ہے، جواب دے رہا ہے، ہدایات اور رہنمائی دے رہا ہے اور ساتھ میں فیصلہ بھی سنا رہا ہے۔میں باقی ساری چیزوں سے صرف نظر کرتے ہوئے صرف فیصلوں کو اپنی اس گفتگو کا موضوع بناؤں گا۔اگر میں باقی چیزوں وضاحت بھی شروع کردوں تو پھر تو یہ پوری سورت کی تفسیر بن جائے گی۔ یہ ظاہر ہے اس وقت میرا موضوع نہیں ہے۔ میرا موضوع لوگوں کے بارے میں اللہ کے فیصلوں کو بیان کرنا اور ان سے قیامت کے دن کے بارے میں کچھ استنباط کرنا ہے۔

سورۂ توبہ کا آغاز

قرآنِ مجید کی تمام سورتوں کے برعکس اس سورت کا آغاز بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے ان کلمات سے نہیں ہوتا جو دراصل اللہ کی رحمت وعنایت کا بیان ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ فیصلۂ عذاب کی سورت ہے اور اس کے شروع میں رحمت کے کلمات بطور سرِ عنوان موزوں نہیں ہیں۔ یہ گویا کہ قیامت کا کنایہ ہے۔قیامت کا حادثہ دراصل اس بات کا نام ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی زمین کو نافرمانوں اور مجرموں کے شکنجے سے آزاد کرانے کا فیصلہ کرلیا ہے۔اس کے لیے اسے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔صرف وہ اپنی اُس رحمت کو واپس لے لے گا جس نے کائنات کی انتہائی طاقتور قوتوں کو انسانوں کے لیے مسخر کر رکھا ہے۔ چنانچہ وہ اس روز ان قوتوں کو ان کے حال پر

چھوڑ دے گا۔اللہ کی رحمت کے اٹھ جانے کے بعد نظامِ کائنات کی یہ قوتیں بربادی کا طوفان بن کر اس دنیا کے باسیوں پر ٹوٹ پڑیں گی اور اس دنیا کو تہہ بالا کر کے رکھ دیں گی۔

مشرکین کا انجام

سورۂ توبہ کے مضامین پر اگر نگاہ ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ دو اجزا میں منقسم ہے۔اس کا پہلا جز ان کفار کے مختلف گروہوں کا معاملہ زیر بحث لاتا ہے جنھوں نے اللہ کے رسول کا انکار کر دیا تھا اور سرزمین عرب کے عالم کفر کا حصہ تھے۔جبکہ دوسرا جز اُن لوگوں کے مختلف گروہوں سے متعلق ہے جو اسلام کو بطور دین قبول کر چکے تھے۔

آیت 1 تا 37 میں اللہ تعالیٰ اسلام کو قبول نہ کرنے والے تین گروہوں کے حوالے سے اپنا فیصلہ سناتے ہیں۔ پہلا گروہ بنی اسماعیل کے مشرکین عرب کا ہے۔ یہ وہ لوگ تھے جو دین شرک پر قائم تھے۔نہ صرف عملاً شرک کرتے تھے بلکہ علانیہ یہ تسلیم کرتے تھے کہ اللہ کے ساتھ کئی اور شرکا ہیں۔ظاہر ہے یہ سنگین ترین بات ہے جو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں بدترین گستاخی ہے۔ چنانچہ سورت کا آغاز اسی گروہ کے ذکر کے ساتھ اور اس فیصلے کے ساتھ ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے اعلانِ براءت کر دیا ہے۔ان مشرکین کے ساتھ امن کے تمام معاہدات ختم۔ چار مہینے کی ایک مہلت ہے جس کے بعد مشرک جہاں پائے جائیں گے مارے جائیں گے، (آیت 5)۔ان کے کفر و سرکشی کی سزا یہ ہے کہ اللہ انھیں مسلمانوں کے ہاتھوں عذاب دے گا، (آیت 14) اور مشرکین مسجد حرام سے بے دخل کر دیے جائیں گے، (28)۔

یہ دنیا میں کفار و مشرکین کے لیے عذاب کا فیصلہ ہے۔جبکہ قرآن مجید کے دیگر مقامات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سرکشوں کو قیامت کے دن زیادہ بڑا عذاب دیا جائے گا۔ یہ جہنم کی وہ ابدی سزا ہے جو ہمیشہ ان کا مقدر بن کر ان کے ساتھ رہے گی۔

اہل کتاب کے کفار کا انجام

آیت 29 سے اہل کتاب کے ان منکرین کی سزا کا اعلان شروع ہو رہا ہے جنھوں نے اللہ اور اس کے رسول کا انکار کر دیا تھا۔ اہل کتاب اپنے تمام تر کفر و شرک کے باوجود چونکہ زبان سے توحید کے مدعی تھے۔ اس لیے قرآن مجید نے مشرکین کے برعکس جن کے لیے سزائے موت کا فیصلہ سنایا گیا تھا، ان کو قدرے ہلکی سزا یہ دی کہ ان کو سزائے موت کے بجائے ذلت کی زندگی نصیب ہوگی۔ وہ ذلیل ہو کر جزیہ دیں گے اور اسی حال میں زندگی گزاریں گے۔

آیت 35 میں یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ ان کے جرائم کی پاداش میں روزِ قیامت ان کے لیے بھی جہنم ہی کی سزا ہوگی۔ تاہم یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ جس طرح دنیا میں انہیں کفار کے قتل کے بالمقابل توحید سے زبانی وابستگی کی بنیاد پر کچھ ہلکی سزا دی گئی، اسی طرح روزِ قیامت کفار کے مقابلے میں ان کی سزا کچھ کم ہوگی۔ یہ توحید کی عظمت ہے کہ اس سے زبانی وابستگی بھی بدترین مجرموں کے لیے کچھ نہ کچھ آسانی کا باعث ہوگی۔ آیئے اسی بات پر ہم سب مل کر اس بات کی شہادت دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد اس کے آخری نبی اور رسول ہیں۔

مسلمانوں کا پہلا گروہ: منافقین

آیت نمبر 38 سے مسلمانوں کا تذکرہ شروع ہوتا ہے اور کفار کی مناسبت سے پہلے منافقین کا ذکر کیا جاتا ہے۔ منافقین یوں تو اپنے انجام کے اعتبار سے کفار سے بھی بدتر جگہ پر ہوں گے، (ان المنافقین فی الدرك الاسفل من النار)، لیکن قانونی طور پر چونکہ وہ مسلمانوں کا حصہ ہیں اسی لیے ان کا ذکر مسلمانوں کے ساتھ ہو رہا ہے۔

جنگِ تبوک کے پس منظر میں سورۂ توبہ میں سب سے زیادہ تفصیل سے انھی منافقین کے احوال اور ان کے مختلف گروہوں کا معاملہ زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ مگر ان سے قبل اللہ تعالیٰ نے

آیت 38 میں ضعیف مسلمانوں کو تنبیہ کی ہے۔ یہ ہمارے جیسے وہ لوگ ہیں جو چار و ناچار مسلمان تو ہوتے ہیں، مگر جب کوئی سخت دینی مطالبہ سامنے آتا ہے تو اس پر لبیک کہنے کے بجائے دنیا کی محبت میں پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ ان کو وارننگ دی گئی ہے کہ اس رویے کا مطلب اللہ کے عذاب کو دعوت دینا ہے اور دنیا میں اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ اللہ تعالیٰ اپنا کام کسی اور سے لے کر ان کو بھی منافقین میں لکھ لیں گے۔

پھر منافقین کا تفصیلی احوال بیان کر کے ان کا فیصلہ کر دیا گیا۔ انہیں نام نہاد ہی سہی مگر اسلام کی بنا پر سزائے موت تو نہیں دی گئی، مگر بدترین ذلت، رسوائی اور عذاب کا فیصلہ ان کے لیے سنا دیا گیا۔ سب سے پہلے انھیں معاشرے میں ایکسپوز کر دیا گیا۔ اہل ایمان کو ان سے سخت رویہ اختیار کرنے کا حکم دیا گیا، (73)۔ حضور کو منع کر دیا گیا کہ انھیں آئندہ کسی جنگ میں ساتھ شرک کریں (83)۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ ان میں سے کسی کے لیے استغفار کریں یا اس کی نمازِ جنازہ پڑھائیں، (84)۔ پھر اس سلسلۂ بیان میں جگہ جگہ آخرت میں ان کے لیے بدترین عذاب کا اعلان کیا گیا ہے۔

مخلص مسلمانوں کے تین گروہ

آخر میں اللہ تعالیٰ نے مخلص مسلمانوں میں سے تین گروہوں کو لے کر ان کا معاملہ بیان کیا ہے۔ پہلا گروہ 'السابقون الاولون' مسلمانوں کا ہے۔ یہ ایمان اور عملِ صالح کے ہر مطالبے میں سبقت لے جانے والے مسلمانوں کا گروہ ہے۔ یہ مہاجرین و انصار اور ان کی بہترین اتباع کرنے والے وہ لوگ ہیں جن کو دنیا ہی کی زندگی میں اللہ کی رضا کا پروانہ اور جنت کی ابدی باشاہی کی نوید سنا دی گئی (100)۔ ظاہر ہے کہ جب قیامت کا دن قائم ہوگا تو یہ نجات پانے والوں میں بھی سب سے پہلا گروہ ہوگا۔

دوسرا گروہ ان مسلمانوں کا ہے جن کا پیچھے ضعیف مسلمانوں کے عنوان سے ذکر آیا ہے۔

انھوں نے اپنے گناہوں کا اعتراف کرلیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ طبعاً سرکش لوگ نہ تھے بلکہ انسانی کمزوریوں کی بنا پر گناہ بھی کرتے تھے اور اپنی نیک طبیعت کی بنا پر اچھے اعمال بھی کرتے تھے۔ یوں ان کے نامۂ اعمال میں اچھے برے دونوں قسم کے اعمال تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں اپنی معافی اور مغفرت کی امید دلائی، (103)۔

میرا قیاس یہ ہے کہ آج امتِ مسلمہ کی ایک بڑی تعداد اصل میں اسی جگہ کھڑی ہوئی ہے۔ ان کے پاس یہ راستہ کھلا ہوا ہے کہ وہ توبہ کرکے مکمل نیکی اور سابقین کی راہ اختیار کرلیں۔ وہ ایسا کرلیں گے تو کل قیامت کے دن ان سابقین ہی کے ساتھ ان کا انجام ہوگا۔ لیکن ایسا نہ ہوا اور یہ لوگ اپنی اسی ملی جلی حالت میں مر گئے یعنی ایسے حال میں کہ اچھے اعمال بھی ہیں اور برے اعمال بھی۔ اس طرح کہ نہ پوری طرح توبہ کی اور نہ سرکش ہوئے کہ بڑے بڑے گناہ کرتے پھریں۔ تو ایسے لوگوں کے بارے میں اس آیت کی روشنی میں گرچہ نجات کی امید کی جاسکتی ہے، لیکن ان کے بارے میں یہ اندیشہ بھی ہے کہ اللہ کے حضور پیشی سے قبل ان کے گناہوں کو جھاڑنے اور ان کا تزکیہ کرنے کے لیے انھیں میدانِ حشر کی سختیوں سے گزرنا پڑے گا۔ ظاہر ہے کہ اُس روز کی معمولی سی سختی بھی اس دنیا کی ہزار سختیوں سے زیادہ سخت اور تکلیف دہ ہوگی۔ میدانِ حشر کی ہزار ہا برس کی مدت کا انتظار دنیا کی سو پچاس سال کی زندگی کا سارا نشہ ہرن کردے گا۔ جبکہ مخلص اہلِ ایمان تو قبر سے اس طرح اٹھیں گے کہ ہر قسم کی سختیوں سے بچا کر رحمت الٰہی کے سائے میں ہوں گے۔

تیسرا گروہ وہ ہے جو باقاعدہ اللہ تعالیٰ کے عتاب کی زد میں آگیا تھا۔ یہ تین مخلص صحابی تھے جو جنگِ تبوک میں استطاعت کے باوجود شریک نہیں ہوئے تھے اور نہ ابتدا میں ان کی توبہ میں وہ شدت تھی جو گناہوں کی معافی کے لیے ضروری ہے۔ چنانچہ ان کی معافی کا معاملہ مؤخر کردیا گیا، لیکن جب انہوں نے صدقِ دل سے توبہ کی تو اللہ تعالیٰ نے انہیں بھی معاف کردیا۔

قیامت کے دن یہ معاملہ اُن مخلص مسلمانوں کا ہوسکتا ہے جن کی نیکیاں اپنی جگہ لیکن ان سے بعض سنگین غلطیاں ہوچکی ہوں گی اور انھوں نے دنیا میں ان غلطیوں کی توبہ مطلوبہ طریقے پر نہیں کی ہوگی۔ نتیجہ یہ نکلے گا کہ انہیں اللہ تعالیٰ بالکل نظر انداز کردیں گے۔ اور دوسرے گروہ کے برعکس ایک طویل عرصے کے لیے انھیں میدانِ حشر کے بدترین حالات بھگتنے کے لیے چھوڑ دیا جائے گا۔ جس کے بعد ان کے اخلاص، ایمان اور نیکیوں کی بنا پر ان کی معافی کا امکان ہے، لیکن یہ ایک انتہائی سنگین رسک ہے جسے لینے کا کوئی سنجیدہ مسلمان تصور بھی نہیں کرسکتا۔

اب ہم میں سے ہر شخص کی ذمے داری ہے کہ وہ اس آئینے میں اپنی تصویر دیکھ لے کہ وہ اپنے عمل کے لحاظ سے کہاں کھڑا ہے۔ اس کا عمل اسے بتادے گا کہ کل قیامت کے دن بالکل متعین طور پر اس کے ساتھ کیا ہونے جارہا ہے۔ اس کے بعد اپنی فکر کرنا نہ کرنا اس کا اپنا کام ہے۔

خالق ومخلوق کے عارف

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے اخری نبی اور رسول تھے۔آپ پر وحی کے ذریعے سے پیغام الٰہی اتارا جاتا اور پھر آپ اپنی زبان مبارک سے اسے انسانوں تک پہنچاتے۔اس مقصد کے لیے ایک طرف آپ خدا اور دوسری طرف انسانوں سے پوری طرح متعلق تھے۔

خالق ومخلوق سے آپ کا یہ تعلق محض رسمی نہیں تھا بلکہ آپ کی سیرت کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ جس طرح آپ خدا کو جانتے تھے کوئی نہیں جانتا تھا اور جس طرح مخلوق کو سمجھتے تھے، کوئی نہیں سمجھ سکتا تھا۔آپ بلاشبہ اس دنیا میں خالق ومخلوق کے سب سے بڑے عارف تھے۔اس کا اندازہ سیرت طیبہ کے دو واقعات سے کیا جا سکتا ہے۔ایک مکی زندگی کا واقعہ ہے اور دوسرا مدنی زندگی کا۔یہ دونوں واقعات آپ کی عارفانہ زندگی کے کلائمکس یا نقطہ عروج کی حیثیت رکھتے ہیں۔

مکی زندگی کا واقعہ

مکہ مکرمہ میں اعلان نبوت کے بعد آپ کو قریش مکہ کی طرف سے زبردست مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔عام لوگ گرچہ ایمان لاتے رہے، مگر سرداروں میں سے کوئی ایمان نہیں لایا۔ابتدا میں انہوں نے کچھ ہلکی مخالفت کی۔مگر پھر اسلام کے اس سیلاب کا راستہ روکنے کے لیے انہوں نے ایمان لانے والوں پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑ ڈالے۔چنانچہ مسلمانوں کو حبشہ ہجرت کرنا پڑی۔جو مسلمان مکہ میں بچے انھیں قریش کے بائیکاٹ کا سامنا کرنا پڑا۔نوبت فاقوں تک آ گئی۔کئی برس

آپ کو اسی ظلم وستم کو سہتے اور بدترین حالات میں دعوت کا کام کرتے ہوئے گزر گئے۔یہاں تک کہ دس نبوی میں آپ کا تحفظ کرتے رہنے والے جناب ابوطالب اور آپ کی مونس وغمگسار محبوب رفیقہ حیات حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا انتقال ہوگیا۔ابوطالب کے بعد ابولہب قبیلہ کا سربراہ بنا اور آپ کو اس قبائلی حمایت سے محروم کردیا جس کے خوف سے کفار مکہ نے آپ کو ابھی تک براہ راست کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا۔چنانچہ اس کے بعد ہی وہ واقعات پیش آئے جس میں کفار نے آپ کے سر پر مٹی یا اوجڑی ڈالی اور دیگر ایسی تکالیف پہنچانی شروع کیں جو ابھی تک نہیں دی تھیں،(ابن ہشام)۔

سفر طائف

ان حالات میں آپ نے ایک آخری چارے کے طور پر طائف جانے کا فیصلہ کیا۔یہ مکہ سے سو کلومیٹر دور ایک بلند پہاڑی مقام یا ہل اسٹیشن (6165 فٹ) تھا جہاں مکہ کے سردار گرمیاں گزارا کرتے تھے۔آپ یہ طویل فاصلہ پیدل طے کرکے اس امید پر طائف پہنچے کہ یہاں کے سرداروں میں سے کوئی ایمان لے آیا تو اس کے اثر سے قریش بھی ایمان لے آئیں گے یا پھر ان کے شر سے مسلمانوں کو کچھ تحفظ مل جائے گا۔اس سفر میں حضرت زید بن حارثہ بھی آپ کے ساتھ تھے۔آپ نے یہاں آباد قبیلہ بنو ثقیف کے تین سرداروں سے مل کر انھیں دعوت اسلام دی۔مگر انھوں نے توہین آمیز جواب دے کر آپ کی دعوت کو رد کردیا۔

آپ نے یہاں دس دن قیام کرکے کم وبیش ہر اہم سردار کو دعوت دی، مگر طائف کے ان پتھروں پر کوئی جونک نہ لگی۔بلکہ یہ لوگ اپنی سنگدلی میں اہل مکہ سے بھی آگے بڑھ گئے۔انھوں نے شہر کے اوباشوں کو آپ کی اذیت رسانی کی مہم پر لگا دیا۔چنانچہ وہ تالیاں پیٹتے، سیٹیاں بجاتے، جملے کستے، گالیاں دیتے آپ کے ساتھ ساتھ چلتے جاتے۔یہ تماشہ دیکھنے کو بھیڑ جمع

ہوگئی۔ اس پر شہہ پا کر ان بدبختوں نے رحمت للعالمین پر پتھروں کی برسات کردی۔ حضرت زید اپنے جسم کو ڈھال بنا کر آپ کو بچانے کی کوشش کرتے، مگر وہ کتنے پتھر روکتے۔ آپ لہولہان ہوگئے اور نعلین مبارک جسم سے بہتے خون سے بھر گئے۔ آخرکار طائف سے تین میل دور ایک باغ میں آپ نے پناہ لی تو ان اوباشوں سے جان چھوٹی۔

بے مثال دعا

یہی وہ وقت تھا جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ دعا مانگی جس نے تاریخ کا رخ موڑ دیا۔ دعا کا ترجمہ درج ذیل ہے:

''یا اللہ! میں تجھ ہی سے اپنی کمزوری، بے سروسامانی اور لوگوں میں اپنی بے قدری کا شکوہ کرتا ہوں۔ اے سب سے بڑھ کر رحم کرنے والے تو ہی ضعیفوں کا رب ہے اور میرا رب بھی تو ہی ہے۔ تو مجھے کن لوگوں کے حوالے کر رہا ہے۔ کسی بیگانے ترش رو کے یا کسی دشمن کے جس کے ہاتھ میں تو نے میرا معاملہ دے دیا ہے؟ اگر مجھ پر تیرا غضب نہیں تو مجھے کوئی پروا نہیں۔ لیکن تیری عافیت میرے لیے کافی ہے۔ میں تیری ہستی کے اس نور کی پناہ چاہتا ہوں جس سے تاریکیاں روشن ہوگئیں اور دنیا و آخرت کے معاملات درست ہوتے ہیں کہ مجھ پر تیرا غضب اترے یا تیری ناراضی مجھ پر آئے۔ تیری رضا ہی مطلوب ہے کہ یہاں تک کہ تو راضی ہوجائے۔ اور تیرے سوا کوئی طاقت ہے نہ قوت۔''، (الجامع الصغیر، رقم:1483)

اس دعا کے الفاظ میں وہ تڑپ ہے جو کسی ترجمے یا تشریح میں بیان نہیں کی جاسکتا۔ اس میں ہر وہ اسلوب موجود ہے جس سے اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ اس میں شکویٰ ہے، مگر یہ شکویٰ اپنی ذات کے حوالے سے کوئی شکایت نہیں بلکہ اس کام کے حوالے سے ایک فریاد ہے

جو اللہ ہی کا تھا اور اس کام کے کرنے والوں کی مدد کا اللہ نے وعدہ کر رکھا ہے۔ اس میں اظہار عجز اور اضطرار ہے۔ مضطر کی فریاد کا جواب دینا اللہ نے اپنے ذمے لے رکھا ہے۔ اس میں امید ہے۔ اس ہستی سے امید ہے جس سے مایوسی کفر ہوتی ہے۔ اس میں سوال ہے۔ اس ہستی سے سوال ہے، جس سے مانگنے والا کبھی محروم نہیں رہتا۔ اس میں دینے والے کی غیرت کو پکارا گیا ہے۔ اس میں تنہا صاحب اقتدار بادشاہ کے غضب سے عافیت اور پناہ کی درخواست ہے۔ اس میں توحید ہے۔ اس میں حمد ہے۔ اس میں تفویض ہے۔ اس میں توکل ہے۔ اس میں رضا ہے۔

غرض اس دعا میں ہر وہ چیز جمع ہے جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ بندوں کے حال پر توجہ کرتے ہیں۔ لیکن حیرت انگیز طور پر اس دعا میں دعا نہیں ہے۔ یعنی اس میں اللہ تعالیٰ سے براہ راست کچھ نہیں مانگا گیا ہے۔ اس دعا کو بار بار پڑھنے سے جو بات واضح ہوتی ہے کہ مانگنے والا اپنے تن، من دھن راہ خدا میں لگا چکا ہے۔ ایک آخری سرمایہ عزت نفس کی شکل میں بچا تھا۔ وہ بھی آج طائف کے بازاروں میں خدا کے لیے لٹا دیا۔ مگر پھر غم دل سنانے کے بجائے صرف یہ فکر دامن گیر ہے کہ رب ناراض نہ ہوجائے۔ جسم ہے کہ خون سے لہولہان ہے۔ دل ہے کہ ٹوٹ کے کرچی کرچی ہوگیا ہے۔ مگر لبوں پر جب التجا آتی ہے تو نہ دشمن کے لیے بددعا ہوتی ہے نہ اپنے لیے کچھ مانگا جاتا ہے۔

تاریخ ساز دعا

مگر یہ دعا تاریخ کا رخ موڑ دیتی ہے۔ احادیث، سیرت اور تاریخ کا مطالعہ صاف بتاتا ہے کہ اس دعا کے بعد سب کچھ بدل دیا گیا۔ فوراً جبریل امین کو بھیجا گیا۔ ان کے ساتھ پہاڑوں پر مامور فرشتے بھیجا گیا کہ ان گستاخوں کو پہاڑوں کے بیچ میں کچل دیا جائے۔ یہ اپنے محبوب کی وہ تالیف قلب کی گئی جو کبھی کسی دوسرے رسول کی نہیں کی گئی کہ قوم کا فیصلہ رسول کے ہاتھ میں دے

دیا۔مگر رحمت للعالمین نے انھیں معاف کر دیا۔ پھر واپسی میں جنوں کی جماعت کو آپ کے پاس بھیجا اور پھر بتایا کہ یہ انسان تمھاری بات نہیں مانتے تو جن مان رہے ہیں۔مکہ میں ابولہب کی جگہ مطعم بن عدی نے آپ کو اپنی پناہ میں لے لیا اور اعلان کر دیا کہ کوئی آپ کو نقصان پہنچانے کی کوشش نہ کرے۔ یہ تین کام تو اسی سفر سے واپسی پر کر دیے گئے۔

پھر اسی برس معراج و اسریٰ کے واقعات میں مستقبل کا فیصلہ واضح طور پر سنا دیا گیا کہ بنی اسماعیل سے مکہ اور بنی اسرائیل سے بیت المقدس لے کر اب قیامت تک کے لیے تمھیں اور تمھارے نام لیواؤں کو امامت عالم دے دی جائے گی۔ یہ محض وعدہ نہ تھا بلکہ اِسی سال یثرب کے لوگوں نے اسلام قبول کیا جس کے بعد ہجرت مدینہ ہوئی اور آپ ایک بادشاہ کی حیثیت سے مدینہ میں داخل ہوئے اور چند ہی برسوں میں فتح مکہ کے بعد پورے عرب کے تنہا حکمران بن گئے۔ پھر ربع صدی کے اندر نبی آخر الزماں کو ماننے والے پوری متمدن دنیا کے حکمران بن گئے۔ اور پھر قیامت تک کے لیے کروڑوں اربوں لوگ پیدا ہوئے جو نبی کا نام سن کر سر عقیدت سے جھکا دیتے ہیں۔

کوئی شخص وہ لمحہ اگر متعین کرنا چاہیے جب یہ سب کچھ ظہور پذیر ہونا شروع ہوا تو بلاشبہ وہ لمحہ اس دعا کو مانگنے کا لمحہ تھا۔ یہ دعا ایک غیر معمولی عارف اور غیر معمولی سیرت و کردار کی شخصیت کی زبان مبارک ہی سے ادا ہوسکتی ہے۔جس میں سب کچھ تھا۔بس دعا ہی نہیں تھی۔اللہ تعالیٰ کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اس دعا کو سن کر حیرت میں پڑ جاتا۔مگر عالم الغیب کو کسی بات پر حیرت نہیں ہوتی۔لیکن اس دعا نے صاحب عرش کے در پر اس طرح دستک دی کے ہر دروازہ کھل گیا۔ یہ ثمرہ بلاشبہ اس بات کا تھا کہ پکارنے والا آخری درجے میں اللہ تعالیٰ سے واقف ہے۔

مدنی زندگی کا واقعہ

دوسرا واقعہ وہ ہے جس کا تعلق انسانوں سے ہے اور یہ انصار مدینہ کے حوالے سے فتح مکہ کے بعد پیش آیا۔اس وقت صورتحال بہت بدل چکی تھی۔مکہ فتح ہو چکا تھا۔حنین کی وادی میں یقینی شکست کو اللہ تعالیٰ کی خصوصی نصرت نے فتح میں بدل دیا تھا۔اس موقع پر مسلمانوں کو بہت زیادہ مال غنیمت ہاتھ لگا۔اس جنگ میں مکہ کے ان نومسلموں کی بڑی تعداد شریک تھی جو ابھی ایمان لائے تھے۔بصیرت نبوی نے یہ دیکھ لیا تھا کہ اس موقع پر ان کے ساتھ احسان کا رویہ اختیار کیا جائے گا تو اس کا دوہرا فائدہ ہوگا۔ایک یہ کہ فتح مکہ کے بعد گرچہ یہ لوگ ایمان لے آئے تھے،مگر یہ دراصل شکست خوردہ قوم کے لوگ تھے۔ان کی انا بری طرح مجروح ہوئی تھی۔ ایسے میں اگر ان کے ساتھ احسان کا معاملہ کر دیا جائے تو یہ ہر پہلو سے اسلام کے مخلص خادم بن جائیں گے۔

بلاشبہ یہ سوچ ایک حقیقت بھی تھی جسے وقت نے سچ ثابت کر دکھایا۔کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جب ہر طرف مرتدین، جھوٹے مدعیان نبوت اور منکرین زکوۃ نے بغاوت کر دی تھی تو اس وقت اہل مکہ پوری قوت کے ساتھ خلافت مدینہ کے ساتھ کھڑے رہے۔ اگر اہل مکہ بھی بغاوت کر دیتے تو پھر صورتحال کو سنبھالنا عملاً ناممکن تھا کیونکہ وہ صدیوں سے عرب کے سردار تھے۔ بغاوت کو قیادت مل جاتی تو خلافت ختم ہو جاتی،مگر رسول اللہ صلی علیہ وسلم کے عفو و درگزر اور پھر اس احسان نے ان کے دل اس طرح جیت لیے کہ اس مشکل میں وہ ثابت قدم رہے۔باغیوں نے ان کی مدد چاہی تو اہل مکہ نے ان کی مدد سے صاف انکار کر دیا۔

تاہم غزوہ حنین کے موقع پر ان پر کی جانے والی اِس خصوصی عنایت کی بنا پر قدیم الاسلام انصار اور خاص کر ان کے نوجوانوں کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم وطن اور ہم نسب قریش ایمان لے آئے ہیں۔اور اس موقع پر ان کو عطا کرنا اور انصار

کو نہ دینا اس بات کی علامت ہے کہ ہماری حیثیت ختم ہو چکی ہے۔ پھر ایک دوسرے پہلو سے انھیں اس عمل سے یہ محسوس ہوا کہ یہ ہماری خدمات کو نظر انداز کرنے کے مترادف ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام کی خدمت میں جو خدمات انصار کی تھیں اس میں ان کا مدمقابل عرب میں کوئی نہ تھا۔ پورے عرب کی دشمنی مول لے کر ایمان لانا اور مدینے کا اقتدار اپنی خوشی سے نبی اللہ کے حوالے کرنے سے لے کر ہر جنگ میں سب سے زیادہ شہادتیں دینا، مواخات میں اپنا مال واسباب مہاجرین میں برابر تقسیم کرنے سے لے کر غزوہ حنین تک اس وقت رسول اللہ کی پکار کا جواب دینا جب دوسرے لوگ بھاگ رہے ہوں، بہت بڑی بات ہے۔

ایسے میں مال غنیمت میں بڑے حصے کی توقع کرنا اور اسے نہ ملنے پر دل گرفتہ ہونا ایک فطری عمل تھا۔ چنانچہ یہ باتیں پھیلیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کانوں تک بھی جا پہنچیں۔ اس پر آپ نے تمام انصار کو ایک جگہ جمع کیا۔ اس موقع پر جو انصار سے جو گفتگو آپ نے فرمائی وہ بلاشبہ انتہائی غیر معمولی گفتگو تھی۔

آپ کا خطبہ

اس موقع پر جو گفتگو آپ نے فرمائی وہ درج ذیل ہے:

اللہ کی حمد وثنا کے بعد آپ نے فرمایا:

''انصار کے لوگو! یہ تمہاری کیا چہ میگوئی ہے جو میرے علم میں آئی ہے! اور یہ کیا ناراضی ہے جو جی ہی جی میں تم نے مجھ پر محسوس کی ہے! کیا ایسا نہیں ہے کہ میں ایسی حالت میں تمہارے پاس آیا کہ تم گمراہ تھے، اللہ نے تمھیں ہدایت دی اور محتاج تھے، اللہ نے تمھیں غنی بنایا۔ اور باہم دشمن تھے، اللہ نے تمہارے دل جوڑ دیے؟ لوگوں نے کہا کیوں نہیں! اللہ اور اس کے رسول کا بڑا فضل وکرم ہے۔

اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، انصار کے لوگو! مجھے جواب کیوں نہیں دیتے؟ انصار نے عرض کیا، یا رسول اللہ بھلا ہم آپ کو کیا جواب دیں؟ اللہ اور اس کے رسول کا بڑا فضل و کرم ہے۔ آپ نے فرمایا: دیکھو! خدا کی قسم، اگر تم چاہو تو کہہ سکتے ہو۔ اور سچ ہی کہو گے اور بات سچ ہی مانی جائے گی کہ آپ ہمارے پاس اس حالت میں آئے کہ آپ کو جھٹلا دیا گیا، ہم نے آپ کی تصدیق کی۔ آپ کو بے یار ومددگار چھوڑ دیا گیا تھا، ہم نے آپ کی مدد کی۔ آپ کو دھتکار دیا گیا تھا، ہم نے آپ کو ٹھکانا دیا۔ آپ محتاج تھے، ہم نے آپ کی غمخواری وغمگساری کی۔

اے انصار کے لوگو! تم اپنے جی میں دنیا کی اس عارضی دولت کے لیے ناراض ہو گئے جس کے ذریعے سے میں نے لوگوں کا دل جوڑا تاکہ وہ مسلمان ہو جائیں اور تم کو تمہارے اسلام کے حوالے کر دیا تھا؟ اے انصار! کیا تم اس سے راضی نہیں کہ لوگ اونٹ اور بکریاں لے جائیں اور تم رسول اللہ کو لے کر اپنے ڈیروں میں پلٹو؟ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے اگر ہجرت نہ ہوتی تو میں بھی انصار ہی کا ایک فرد ہوتا۔ اگر سارے لوگ ایک راہ چلیں اور انصار دوسری راہ چلیں تو میں بھی انصار ہی کی راہ چلوں گا۔ اے اللہ رحم فرما انصار پر اور ان کے بیٹوں پر اور ان کے بیٹوں کے بیٹوں (پوتوں) پر۔''، (الرحیق المختوم، 571)

رسول اللہ صل اللہ علیہ وسلم کا یہ خطاب سن کر لوگ اس قدر روئے کہ ڈاڑھیاں تر ہو گئیں اور کہنے لگے: ہم راضی ہیں کہ ہمارے حصے اور نصیب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہوں۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واپس ہو گئے اور لوگ بھی بکھر گئے۔

انسان کی معرفت

یہ خطبہ اس بات کی بہترین مثال ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کس طرح انسانوں کے مزاج کو سمجھنے والے تھے اور کتنی خوبصورتی سے آپ نے اس صورتحال کو کنٹرول کیا۔ پہلے قانون اور

حقائق کی سطح پر مخاطب ہو کر ان پر یہ واضح کیا کہ نعمتِ ایمان سے لے کر دنیا میں ملنے والی فراخی، اقتدار اور غلبے کی جو کیفیت انصار کو آج حاصل ہے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا صدقہ ہی ہے۔ انھوں نے بلا تامل یہ بات مان لی۔ اگر آپ بات یہیں ختم کر دیتے تب بھی فوری مسئلہ ختم ہو جاتا۔ مگر اس کے بعد جو کچھ آپ نے کہا وہ کسی کے سان و گمان میں بھی نہیں تھا۔ آپ نے انصار کے فضائل اور احسان بیان کیے اور اس خوبی سے انصار کی خدمات کا اعتراف کہ پتھر سے پتھر دل بھی پگھل جائے اور عناد و ناراضی کی ہر کیفیت دور ہو جائے۔ پھر آخر میں یہ کہنا کہ اے نصار! کیا تم اس سے راضی نہیں کہ لوگ اونٹ اور بکریاں لے جائیں اور تم رسول اللہ کو ساتھ لے جاؤ تو گویا لوگوں کے دل و دماغ کو ہلا کر رکھ دینے والی بات تھی۔ اس کے بعد ممکن ہی نہیں تھا کہ شیطان کسی کے ذہن میں وسوسہ انگیزی کر کے اسے بہکا سکے۔ چنانچہ وفات رسول کے بعد جب انصار کے کچھ لوگوں نے خلافت کا استحقاق انصار کے لیے ثابت کرنا چاہا تو سیدنا ابو بکر نے اسی موقع پر کیے جانے والے کچھ دیگر ارشادات یاد دلا کر مسلمانوں کے اتحاد کو پارہ پارہ ہونے سے بچایا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہی وہ بے مثل شخصیت تھی جس کے سامنے جو پتھر بھی آیا پگھل کر رہ گیا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے رؤف و رحیم کا خطاب پانے والی یہی شخصیت آج انسانیت کے سامنے پیش کرنے والی سب سے بڑی چیز ہے۔

''کھول آنکھ زمیں دیکھ''

(ابو یحییٰ کی نئی کتاب)

- ☆ مغرب اور مشرق کے سات اہم ممالک کا سفرنامہ
- ☆ کینیڈا، امریکہ کی زندگی کا تفصیلی جائزہ
- ☆ مکہ، مدینہ کی مقدس سرزمین اور سعودی عرب کا احوال
- ☆ سری لنکا، تھائی لینڈ، ملائیشیا اور سنگاپور کی زندگی کا نقشہ
- ☆ مغرب اور مشرق کے ممالک کا تقابل اور اسلام کی علمی برتری کا بیان
- ☆ مغربی تہذیب کی کمزوریوں نظام کی خوبیوں کا بے لاگ جائزہ
- ☆ سات ممالک کے اہم قابل دید مقامات کی دلچسپ منظرکشی
- ☆ سفرنامے کے اسلوب میں لکھی گئی ایک اہم فکری کتاب

(مزید معلومات کے لیے رابطہ: 03323051201)

”جب زندگی شروع ہوگی“

(مصنف: ابویحییٰ)

☆ ایک ایسی کتاب جس نے دنیا بھر میں تہلکہ مچادیا

☆ ایک ایسی تحریر جسے لاکھوں لوگوں نے پڑھا

☆ ایک ایسی تحریر جس نے بہت سی زندگیاں بدل دی

☆ ایک ایسی تحریر جواب ایک تحریک بن چکی ہے

☆ آنے والی دنیااورنئی زندگی کا جامع نقشہ ایک دلچسپ ناول کی شکل میں

☆ ایک ایسی تحریر جواللہ اوراس کی ملاقات پرآپ کا یقین تازہ کردے گی

☆ علم وادب کی تاریخ میں اپنی نوعیت کی پہلی تصنیف

(مزید معلومات کے لیے رابطہ: 03323051201)